مُجھے اعتبارِ وفا ملے
نبیلہ ابر راجہ
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

مجھے اعتبارِ وفا ملے

شیر افگن بڑے صبر سے سگنل گرین ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ سمیر ملک تنگ آ کر شیشے سے باہر جھانکنے لگا۔ سامنے سٹاپ پر گرلز کالج کا ایک گروپ کھڑا تھا۔

''واہ! کیا تازگی ہے، بہار کی پہلی ہوا کی طرح کسی نوشگفتہ کلی کی مانند۔'' پتہ نہیں سمیر نے کس ترنگ میں یہ فقرے کہے۔ شیر افگن متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ''کمال ہے، پولیس والے ایسی شاعرانہ گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔'' وہ دھیمے سے ہنسا۔

''ایسی شکل دیکھ کر خود بخود شاعری سوجھنے لگتی ہے۔ ذرا دیکھو تو وہ سامنے اس لڑکی کو جس نے کالی فائل سینے سے لگائی ہوئی ہے اور ہنس رہی ہے۔''

شیر افگن نے نہ چاہتے ہوئے بھی دیکھا۔ یونیفارم میں ملبوس چار پانچ لڑکیاں تھیں ان میں سے ایک بری طرح ہنس رہی تھی۔ وہ اپنے آپ سے لاپرواہ تھی۔ دوپٹہ شانے سے ڈھلکا ہوا ایک پلو زمین کو چھو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا وہ رش سے بھرے اسٹاپ کے بجائے اپنے گھر کے اندر ہے جو اسے گرد و پیش کا بھی ہوش نہیں ہے۔ اس کے انداز کی بے خبری کے باعث مچلے بڑی وضاحت سے آنکھیں سینک رہے تھے۔ افگن کو بہت غصہ آیا۔ ایسی لاپرواہ لڑکیاں اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ کالج میں آنے کے بعد تو لڑکیاں اچھی خاصی میچور ہو جاتی ہیں۔

''سمیر! ہم قانون کے محافظ ہیں اسٹریٹ لورز اور بے فکرے نوجوان نہیں ہیں اس طرح کی حرکتیں ہمیں سوٹ نہیں کرتی ہیں۔'' افگن نے اسے جھاڑا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

''نہیں کروں گا ڈی ایس پی صاحب آئندہ ایسی حرکت۔'' وہ خفت مٹانے کو تارض لہجے میں بولا۔ اسی لمحے سگنل کھل گیا۔ گاڑیاں رینگنا شروع ہو گئیں۔ شیر افگن نے بھی جیپ سٹارٹ کر دی۔ سمیر نے اس سے چوری ایک بار پھر اس لڑکی کو دیکھا۔ اب ان کی گاڑی ان کے خاصے قریب ہو گئی تھی۔ وہ ہنوز اسی انداز میں مسکرا رہی تھی بلکہ فائل کو جھلا رہی تھی۔

''میں نے رات کو وان ڈیم کی ''یونیورسل سولجر'' دیکھی، بہت اچھی لگی مجھے۔'' وہ فائل جھلاتے جھلاتے رک کر ساتھی لڑکی سے مخاطب ہوئی۔ شیر افگن بالکل بھی متوجہ نہیں تھا۔ وہ آگے نکلنے والی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔

''ہونہہ! زاہد خشک مومن و عابد کہیں کا۔'' سمیر نے دانت پیس کر اسے زیر لب کوسا۔ وہ اب ان لڑکیوں سے آگے نکل آئے تھے۔

☆☆☆

"تو بھلا اب گھر تبدیل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک سال پہلے ہی تو گلشن والے گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ اب پھر نئے سرے سے ہر چیز سیٹ کرنی پڑے گی۔" موی چیزیں اٹھاتے ہوئے اچھا خاصا بڑبڑا رہی تھی۔ ثناء اس کے برعکس خاموشی سے اپنا سامان سمیٹ رہی تھی۔

"بیٹا اب ہم ڈیفنس شفٹ ہو رہے ہیں۔ امیر لوگوں کے علاقے میں اچھے لوگوں سے میل جول بڑھے گا تو ہمیں بڑا فائدہ رہے گا۔ آخر تمہاری اور ثناء کی شادیاں بھی تو کرنی ہیں۔" راحت نے رسان سے سمجھایا تو آخری بات پر اسے شاک سا لگا۔

"میں کوئی نہیں کروں گی شادی وادی۔ آپ ثناء کی کردیں، میں تو صحافی بنوں گی بلکہ کرائم رپورٹر۔"

"میں کون سا ابھی تمہیں رخصت کرنے لگی ہوں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد دیکھا جائے گا۔" وہ بولیں تو موی نے سکون کا سانس لیا۔

اگلے دو روز میں وہ ڈیفنس شفٹ ہو گئے۔ دو ہزار گز پلاٹ پر بنا یہ بنگلہ ان کی توقعات سے زیادہ وسیع تھا۔ موی نے جاتے ہی لان کی طرف بنے کمرے پر قبضہ کرلیا۔ ایک کمرے کو اسٹڈی روم بنالیا جس کی کھڑکی بغلی لان کی طرف کھلتی تھی۔ اب وہ بہت پرجوش تھی ورنہ آتے ہوئے اس کا منہ لٹکا ہوا تھا جیسے سارا کام اسے ہی کرنا ہوگا۔ اب حال یہ تھا کہ وہ تو مزے سے گھر کا جائزہ لیتی پھر رہی تھی جبکہ امی، ثناء اور ملازمین کے ساتھ سامان سیٹ کروا رہی تھیں۔ یہ کہاں ایک روز میں ختم ہونے والا کام تھا پھر بھی رات تک کسی نہ کسی حد تک انہوں نے کافی کچھ کام کر ہی لیا۔ سلطان ریسٹورنٹ سے کھانا پیک کروا کر لے آیا تھا جو انہوں نے رات دس بجے بیٹھ کر کھایا۔ کھانے کے بعد ثناء اور راحت تو سو گئیں۔ موی جاگتی رہی۔ وہ گزرے وقت پر غور کر رہی تھی جب سے وہ ذرا سمجھدار ہوئی تھی خود کو شہر شہر، محلہ محلہ، گلی گلی، گھر تبدیل کرتے دیکھ رہی تھی۔ اسے یاد تھا یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب وہ کلاس تھری اور ثناء سکستھ کلاس کی طالبہ تھی۔ وہ راولپنڈی کے نواح میں واقع ڈھوک کھبہ میں رہائش پذیر تھے۔ ایک بے حد عام سے مکان میں جس کا فرش اور پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے باپ فواد حسن کو باقاعدہ کام پر کبھی نہیں جاتے دیکھا۔ اس وقت اتنی سمجھ ہی نہیں تھی مکان کی بدحالی کے باوجود دونوں بہنیں ایک نہایت مہنگے انگلش میڈیم سکول میں زیر تعلیم تھیں۔ وین والا لینے اور چھوڑنے جاتا تھا۔ فواد حسن کبھی ان کے سکول میں نہیں گئے۔ پیرنٹس ڈے پر بھی صرف راحت ہی جاتیں فواد غائب ہو جاتے۔ پھر کچھ ماہ بعد اچانک انہیں مکان چھوڑنے کا حکم ہوا۔ فواد نے کہا وہ اب لاہور جا رہے ہیں چنانچہ وہ پھر لاہور چلے آئے۔ رہائش اب بھی ان کی ایک غریب سی بستی میں رہی پھر وہ مکان بھی انہیں چھوڑنا پڑ گیا وہ اچھرہ میں آ گئے تب سے لے کر اب تک آٹھ بار گھر بدل چکے تھے کراچی آئے انہیں ڈیڑھ سال ہوا تھا۔ اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں چار بار ان کی رہائش تبدیل ہوئی۔ نیپا چورنگی سے پی ای سی ایچ ایس وہاں سے گلشن اور پھر اب وہ ڈیفنس میں شفٹ ہوئے۔

فواد حسن آج کل بنکاک میں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بزنس کے دوران انہیں لمبے عرصے تک باہر رہنا پڑے گا انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ گھر میں دو نوکر اور گیٹ پر چوکیدار چوبیس گھنٹے موجود رہتا۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو راحت قریبی مارکیٹ سے سودا سلف لے آتی تھیں۔ ہر تیسرے چوتھے روز سلطان گوشت لے آتا۔ تازہ سبزی بھی خرید لانے کی ذمہ داری اسی کی تھی۔ ٹیلی فون، بجلی، گیس، پانی کے بل ملازم لڑکا جمع کروا آتا تھا۔ ثناء کو یونیورسٹی اور اسے کالج لے جانے کے لیے الگ سے ڈرائیور رکھا گیا تھا۔ فواد کی غیر موجودگی میں بظاہر تو کسی کو کوئی مجبوری نہیں تھی۔ فواد کی بات میں بھی وزن تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ بنکاک میں ان کی کمپنی نیا آفس کھولنے کے منصوبے پر کاغذی کارروائی مکمل کر رہی ہے لہٰذا وہ روز

روز پاکستان کا چکر نہیں لگا سکتے۔ وہ آتے بھی دو تین روز کے لیے اور پھر لوٹ جاتے۔ ثناء تو خیر بڑی میچور اور معاملہ فہم لڑکی تھی۔ موی اس کے برعکس خاصی ضدی اور امیچور تھی۔ اس میں شاید زیادہ قصور اس کی عمر کا تھا جس میں انسان کسی دلیل و جواز کو خاطر میں لاتا ہی نہیں ہے۔ وہ بڑے لاڈ سے باپ کے گلے میں بازو ڈال کر کہتی۔

''اب آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ ہمارے پاس رہیں گے۔''

وہ سر جھکا کر اس کی بات مان لیتے۔ صبح ان کا خالی کمرہ موی کا منہ چڑا رہا ہوتا۔ پھر وہ خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر روتی۔ راحت اور ثناء سے سنبھالنا مشکل ہو جاتا اس ڈر سے وہ اس کی ہر بات مانتیں۔ راحت کی بڑی خواہش تھی کہ میٹرک کے بعد وہ سائنس کے مضامین رکھے مگر اسے سائنس سے بالکل بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے آرٹس کے مضامین رکھے۔ ثناء نے ان کی خواہش کا پورا احترام کرنے کی کوشش کی مگر ایف ایس سی میں اس کے مطلوبہ معیار کے نمبر نہیں آئے۔ اس نے بی ایس سی کرنے کے بعد حال ہی میں یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ ثناء کے فیوچر کے بارے میں کم از کم انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر ڈر تھا تو موی کی طرف سے۔ جس کا رویہ ابھی تک بچپن اور جوانی کے سنگم پر کہیں جھول رہا تھا۔ وہ بڑے انوکھے سوال کر کے انہیں زچ کر دیتی۔ جب وہ دوسری جماعت کی طالبہ تھی تو ماں سے اکثر پوچھتی رہی دادی، دادا، چچا، پھوپھا، ماموں، خالہ، نانا، نانی کیوں نہیں ہیں، جس طرح اور بچوں کے ہیں۔ راحت کہتیں کہ سب اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں۔ وہ کہتی کہ کیوں چلے گئے ہیں، فرحی کے تو نہیں گئے۔ غرضیکہ اس طرح کی باتیں کر کے وہ انہیں لاجواب کر دیتی۔

موی نے اپنی دوستوں کو نئے گھر میں ٹی پارٹی پر انوائٹ کیا تھا۔ کراچی آنے سے پہلے انہیں یعنی ثناء اور موی کو دوستوں کو گھر بلانے اور ان کے گھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں آنے کے بعد یہ پابندی ختم ہو رہی تھی اسی لیے موی نے یہ دعوت کی تھی۔ ثناء نے اچھی خاصی مدد کی تھی۔ آخری آئٹم بننے تک وہ کچن میں ہی موجود رہی۔ موی کی دوستوں نے کھانے پینے کی چیزوں سے پورا پورا انصاف کیا۔ پھر وہ اوپر ٹیرس پر چڑھ گئیں۔

موی فواد حسن کا فون آنے پر نیچے چلی آئی اوپر سے وہ ساری چنڈال چوکڑی اسے مسلسل آوازیں دے رہی تھی۔ وہ گھبرا کر اوپر چڑھ آئی۔

''کیا ہوا ہے، کیوں چلا رہی ہو؟''

''ہائے بڑی دیر کر دی ہے، سمجھو کہ قیامت آتے آتے رہ گئی۔'' زارا نے بازو پھیلا کر بتایا۔

''ہائیں کونسی قیامت!'' وہ حیران ہوئی تو زوشاف، مدیحہ، اقصیٰ اور ساریہ مسکرائیں۔

''ابھی ابھی ہم نے ایک بزنس چارمنگ دیکھا تھا۔ آنکھیں ذیشان سکندر سے بھی زیادہ تاثر انگیز اور نشیلی ہیں اور مونچھیں......''

''ہٹلر کی طرح تھیں۔'' موی نے دخل اندازی کی تو زارا اسے گھورنے لگی۔

''تم نے دیکھا نہیں ہے ناں اسے ورنہ چھت سے گر کر بے ہوش ہو جاتیں۔ اف ذیشان سکندر جیسی آنکھیں۔'' زارا کے منہ سے ایک حسرت بھری آہ خارج ہوئی۔ وہ آج کل ذیشان سکندر پہ مر رہی تھی۔ ان سب دوستوں کو معلوم تھا اس کی یہ کیفیت چند روزہ ہے جونہی کوئی نئی شکل نظر آئی وہ ذیشان سکندر کی آنکھوں کو بھول جائے گی جس کا تازہ ترین ثبوت ابھی کچھ دیر پیشتر نظر آنے والے کوئی موصوف تھے جن کے دیدار سے موی محروم رہی۔

''کون تھا، کہاں دیکھا تم نے اسے۔'' وہ بھی جاننا چاہ رہی تھی۔

''تمہارے ساتھ والے بنگلے کے گیٹ سے اسے اندر آتے دیکھا ہے غالباً یہیں رہتا ہے تمہارے تو مزے آ گئے ہیں۔ روز دیکھو گی ایک ہم ہیں۔'' اس نے پھر ٹھنڈی سانس لی تو اقصیٰ اور موی نے بیک وقت اسے دھپ لگائی۔

''سچ موی! تم ضرور ان کے گھر جانا۔ موصوف کا بائیو ڈیٹا معلوم کرنے کی کوشش کرو آخر تمہارے فرسٹ ڈور نیبر ہیں سو حقوق ہیں تمہارے۔'' وہ چالاکی سے بولی تو سب مسکرا دیں۔

نیچے راحت کچن میں مختلف اشیاء ٹرے میں لگا رہی تھیں۔ ''ثناء یہ ساتھ والے بنگلے میں دے آؤ پھر واپس آ کر تین چار اور گھروں میں بھی دے آؤ۔'' انہوں نے دستر خوان سے ڈھانپ کر ٹرے اسے پکڑائی۔

''امی پتہ نہیں یہاں کے لوگ ان روایتوں وخلوص کو پسند کرتے ہیں یا نہیں.....'' وہ ہچکچائی۔

''بیٹا! ابھی تک ہم یہاں کسی کے گھر نہیں گئے ہیں، میل جول تو رکھنا پڑے گا۔ انسان معاشرتی حیوان ہے۔ دوسروں سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر ہم کہیں آئیں جائیں گے نہیں تو لوگوں کے اخلاق کے بارے میں ہمیں کیسے پتہ چلے گا۔ پھر پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے کا حکم ہے ہمارے مذہب میں۔ جاؤ شاباش ہم جائیں گے تو کوئی ہمارے گھر بھی آئے گا۔'' وہ نرمی سے بولیں تو اسے ماننا ہی پڑا۔ ایک ہاتھ سے ٹرے تھامے دوسرے ہاتھ سے اس نے بیل دی۔ ماربل کی تختی پر واضح الفاظ میں شیر دل ہاؤس کا نام چمک رہا تھا۔ وہ مرعوب سی ہو گئی۔

گیٹ اس کی ہم عمر ایک لڑکی نے کھولا۔ اسے دیکھتے ہی لڑکی نے خوشگوار مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجائی۔ ثناء نے مختصراً اسے اپنے بارے میں بتایا۔ اسی اثناء میں وہ اندر پہنچ چکی تھی۔ جہاں ایک بوڑھی مگر باوقار خاتون سفید ساڑھی میں ملبوس کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ ثناء نے دھیرے سے سلام کیا۔ اس کی آمد کی نوعیت سے آگاہ ہوتے ہی وہ شرمندہ ہو گئیں۔

''بیٹا! میں روز ارادہ ہی کرتی رہ گئی کہ نئے پڑوسیوں کے ہاں آج جاؤں گی کل جاؤں گی اور تم آ بھی گئیں۔''

''کوئی بات نہیں آنٹی کل آ جائیں ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ میری امی اور بہن آپ سے مل کر خوش ہوں گی۔'' وہ اخلاق سے بولی اس دوران ایک پینسٹھ ستر سال کی درمیانی عمر کا ایک آدمی بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

مسز شیر دل نے تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ یہ میرے سسر سنگین خان ہیں۔ جواباً انہوں نے بڑی شفقت سے ثناء کے سر پر ہاتھ پھیر کر حال احوال دریافت کیا۔ بلوشہ کھانے سے بھری ٹرالی لیے آ گئی تھی۔ ثناء نے معذرت کرتے ہوئے اٹھنا چاہا مگر ان تینوں نے کچھ کھائے پیئے بغیر اسے آنے نہیں دیا۔ ثناء ان لوگوں کے بارے میں اچھے خیالات لے کر لوٹی تھی۔

موی کی سہیلیاں جا چکی تھیں۔ راحت مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں موی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ آواز پورے گھر میں پھیلی تھی وہ فل آواز میں ٹی وی لگاتی تھی۔ سپورٹس چینل پر ریسلنگ لگی ہوئی تھی۔ موی کی دلچسپی قابل دید تھی۔ انڈر ٹیکر اس کا پسندیدہ ریسلر تھا اس وقت جو مقابلہ دکھایا جا رہا تھا وہ پرانا تھا۔ کئی بار پہلے بھی دکھایا جا چکا تھا مگر موی روز اول سے شوق و ذوق سے دیکھ رہی تھی۔

ثناء اٹھ گئی۔ اسے ریسلنگ سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ یہ موی کے شوق تھے۔ فارغ اوقات میں وہ جاسوسی رسالے پڑھتی یا پھر وی سی آر لگا کر ریسلنگ دیکھتی۔ ایکشن سے بھرپور مار دھاڑ والی فلمیں اس کا دوسرا شوق تھا۔ راحت دیکھ رہی تھیں کہ وہ پڑھائی کی طرف کم اور ان باتوں پر زیادہ توجہ دے رہی ہے جب دیکھو اس کے ہاتھ میں جاسوسی ناول دبا ہوتا یا پھر وہ ٹی وی سکرین کے آگے بیٹھی وان ڈیم، آرنلڈ شواز نیگر اور جیکی چن کی فلمیں دیکھتی ملتی۔ ان کی پریشانی فطری تھی۔ ثناء ہی انہیں تسلی دیتی۔

☆☆☆

مسز شیر دل اور پلوشہ دونوں وعدے کے مطابق اگلے روز ان کے گھر آئیں۔ انہی کی زبانی علم ہوا کہ مسٹر شیر دل فوت ہو چکے ہیں۔ ان کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے، پلوشہ انگریزی ادب میں ماسٹرز کر رہی تھی جبکہ بیٹا پولیس ڈیپارٹمنٹ میں تھا۔ وہ اپنے سسر کو بھی شوہر کی وفات کے بعد ساتھ لے آئیں کیونکہ ان کا کوئی اور بیٹا نہیں تھا۔ بیٹیاں شادی شدہ تھیں۔ وہ ان کے ساتھ پرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ مسز شیر دل نے سسر کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ وہ پوتے پوتی اور بہو سے خوش تھے۔ پلوشہ کی بات پھوپھی کے بیٹے سے طے ہو چکی تھی۔ اس کے ایم اے کے بعد شادی ہونی تھی اس کا منگیتر ارباز ڈاکٹر تھا۔ بس اس کی خواہش تھی کہ بھائی بھی جلدی سے کوئی لڑکی پسند کر لیں تاکہ اس کے جانے کے بعد ماں اکیلی نہ رہے۔ مگر وہ صفائی سے اس موضوع کو ٹال جاتا۔ ثناء کو دیکھتے ہی بے اختیار دل کے نہاں خانوں سے آرزوئیں کروٹ لے کر بیدار ہو گئیں کہ کاش بھائی اس لڑکی کو پسند کر لیں جوان کے لیے چوڑے سحر انگیز سراپے کے لیے بالکل ٹھیک تھی۔

ثناء نے سوئی ہوئی موی کو جگا کر ڈرائنگ روم کی طرف روانہ کیا۔ وہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر کچی نیند سے بیدار کیے جانے پر آنے والے مہمانوں کو کوس رہی تھی۔ آج کالج میں کوئی کلاس نہیں ہوئی تھی وہ زارا، اقصیٰ، زوشاف اور مدیحہ کے ساتھ طویل رقبے پر پھیلے کالج میں گھومتی رہی تھی اس لیے تھکن ہو رہی تھی۔ آتے ہی وہ کھانا کھائے بغیر پڑ کر سو گئی تھی۔ اب ثناء نے مہمانوں کے آنے کی اطلاع دے کر اسے اٹھا دیا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے حتی الامکان کوشش کی کہ ناگواری اس کے لہجے سے عیاں نہ ہونے پائے۔ راحت نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

"یہ میری چھوٹی بیٹی ہے مومنہ حسن۔ پیار سے ہم اسے موی کہتے ہیں سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہے۔" انہوں نے تعارف کرایا۔

پلوشہ اور دروشے کی آنکھوں میں پسندیدگی تھی۔ "ماشاءاللہ بڑی خوبصورت ہے ہماری بیٹی۔ نام بھی مناسب ہے موی، واقعی یہ تو موی گڑیا لگتی ہے۔" دروشے نے سراہا تو اس کی ناگواری دور ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں وہ ان سے بے تکلف ہو گئی۔ پلوشہ البتہ ثناء کی طرح کم گو تھی۔ دھیرے دھیرے مسکراتی رہی۔ اس نے نوٹ کیا کہ ثناء کی طرح موی میں احتیاط پسندی اور ٹھہراؤ نہیں ہے۔ بچپنے کے تاثرات شاید ابھی تک اس پر سے زائل نہیں ہوئے تھے پھر بھی وہ اسے اچھی لگی۔ شیر دل کی وفات بلکہ شہادت کے بعد ان کے لب ہنسی سے ناآشنا ہی رہے تھے۔ پندرہ طویل برسوں کے بعد مسکراہٹ ان کے چہرے پر چمکی تھی۔ اس نے گھر آ کر شیر افگن کو یہ خوشخبری سنائی وہ بھی بہت خوش ہوا۔

"بھائی جان یہ خوشی یہ مسکراہٹ دائمی ہو سکتی ہے اگر آپ شادی کر لیں۔ آپ کے بچوں کو ہنستے کھیلتے دیکھنا ان کی آرزو ہے۔" پلوشہ نے

موقع پا کر بھائی کو گھیر لیا۔

"ہر چیز کا وقت ہوتا ہے میری شادی کا بھی جب وقت آیا تو ہو جائے گی۔" وہ پانی کا گلاس واپس رکھتے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"آپ کو کوئی لڑکی تو پسند نہیں ہے۔" اس نے اس کا چہرہ جانچا اور کچھ جاننے کی کوشش کی جس میں ہمیشہ کی طرح اسے ناکام ہوئی۔ شیر افگن کا وجیہہ دلکش بے تاثر رہا۔

"پلوشہ! جس آگ میں، میں جل رہا ہوں وہاں کسی نرم و گرم جذبے کوئی گزر نہیں ہے۔ ویرانوں میں پھول کھل سکتے ہیں مگر میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا۔" وہ بے پناہ سنجیدہ تھا پلوشہ شیر افگن کے پتھریلے سرد تاثرات دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سب بیکار ہی تھا۔

☆☆☆

دسمبر کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ سردی معمول سے زیادہ ہی پڑ رہی تھی۔ موی چھ بجے کے قریب بیدار ہو گئی۔ وہ بڑی باقاعدگی سے قریبی پارک میں ٹہلنے جاتی تھی۔ اسے اب سائیکل چلانے کا شوق ہو گیا تھا۔ مزے سے سائیکل لے کر نکل جاتی اور ایک گھنٹے بعد ہی واپس آتی۔ موی نے پردہ سرکا کر باہر جھانکا، ہلکا ہلکا اندھیرا اور دھند ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ اسے سارا منظر کسی خوفناک فلم کا سین لگا جیسے ابھی کہیں سے کوئی بدروح نمودار ہو جائے گی۔ اسے اپنے خیالات پر ہنسی آ گئی۔ وہ دروازہ کھول کر جوگرز پہن کر آہستگی سے باہر نکلی۔ باہر آتے ہی اس کے دانت کپکپانے لگے۔ وہ سویٹر پہنے بغیر نکلی تھی۔ دوبارہ اندر جا کر اس نے بیڈ پر پڑا سویٹر پہنا، مفلر لپیٹا۔

اس کی سائیکل لان میں کھڑی تھی۔ موی اس پر سوار ہو کر گیٹ سے باہر آ گئی۔ چوکیدار نے روکنا چاہا کہ دھند ہے آگے نہ جائیں رات گرنے والی اوس سے سڑک پر پھسلن بھی ہو رہی تھی مگر موی لاپروا بھی تھی۔ راحت بیگم نے اسے منع بھی کیا تھا کہ صبح نہ جانا کیونکہ موسم کی خبروں میں بتایا گیا تھا کہ کل دھند ہو گی مگر وہ انہیں اور چوکیدار کو چکمہ دے کر نکل آئی تھی۔ دھند کی وجہ سے چند فٹ آگے کی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ابھی سورج بھی نہیں نکلا تھا۔ دھند کی بدولت ملگجا سا ماحول تھا۔ سٹریٹ لائٹس کی روشنی ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ موی کو اپنی حماقت کا احساس خاصی دیر میں ہوا جب اس کی سائیکل کسی انسانی وجود سے ٹکرائی اور وہ پوری قوت سے نیچے گری۔ دائیں ٹانگ سائیکل کے ٹائر میں گھس گئی۔ بے اختیار اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ اس کا سر پختہ سڑک سے بری طرح ٹکرایا تھا۔

شیر افگن غصے میں اُبلتا مڑا نہ جانے کون احمق تھا جو اس دھند میں سائیکلنگ کا شوق پورا کرنے نکل آیا تھا۔ وہ خود گرتے گرتے بچا تھا۔ اگر سامنے الیکٹرک پول کو نہ تھام لیتا تو یقیناً گر پڑتا۔ وہ معمول کے مطابق جاگنگ اور ایکسر سائز کرنے نکلا تھا۔ برسوں سے اس کے معمولات میں تبدیلی نہیں آئی تھی آج یہ دھند بھی اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوئی۔ جسمانی طور پر وہ بے پناہ پھرتیلا اور طاقتور تھا۔ یہ اس کے پیشے کا تقاضا تھا کہ وہ خود کو فٹ رکھتا۔ افسران کا کہنا تھا کہ عرصے بعد پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اس جیسا آفیسر آیا ہے۔ ادھوری چیخ سے وہ جان گیا کہ یہ کوئی نسوانی وجود ہے۔ وہ آگے ہوا تو منظر واضح ہو گیا۔ لڑکی سڑک پر منہ کے بل گری تھی اور اس کی ٹانگ چلتے ٹائر میں پھنسی ہوئی تھی۔ شیر افگن نے اس کی ٹانگ کو رہائی دلائی۔

"محترمہ! کس حکیم نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ سائیکل لے کر نکلیں۔" وہ درشت لہجے میں بولا تو موی نے سر اٹھایا چونکہ وہ اس کے قریب

کھڑا تھا اس لیے اس نے پل بھر میں اس کا جائزہ لے ڈالا۔ بڑا سحر انگیز مرد تھا۔ اسے مرد ہی کہنا چاہیے تھا کیونکہ اس کی عمر کسی طرح بھی تیس سال سے کم نہیں لگتی تھی۔ شیر افگن کو یوں لگا جیسے وہ اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہے مگر یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔

موی نے اپنا گرا مفلر اٹھا کر کانوں کے گرد لپیٹا۔

''جسٹ اے منٹ۔ واپس اس پر سوار ہو کر مت جائیں۔'' شیر افگن نے بے اختیار آگے سے ہینڈل کو تھام کر جیسے اسے وارننگ دی۔

''نہیں جاؤں گی۔'' وہ جیسے ناراضگی سے بولی۔

''آپ باہر ہی کیوں نکلیں؟'' اس نے اسے ڈانٹا تو موی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''آپ کیوں نکلے ہیں؟'' شیر افگن کا دل چاہا اس کا دماغ درست کر دے بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے اکڑ رہی تھی۔ وہ واپسی کے لیے مڑ گئی۔ دائیں ٹانگ درد تو کر رہی تھی مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے ماتھے پر ابھرا گومڑ دیکھ کر راحت کو اس پر بیک وقت غصہ اور پیار آ گیا۔ اس روز اس نے کالج سے چھٹی کی۔ دوسرے روز گئی تو ہلکا ہلکا نشان تب بھی ماتھے پر موجود تھا۔ دوستوں کے پوچھنے پر اس نے صاف صاف بتا دیا بلکہ اس بدتمیز آدمی کو بھی کوسا جو اسے ڈانٹ رہا تھا۔

''موی! تم نے اس کی آنکھیں دیکھی تھیں۔'' زارا بدتمیزی سے آگے ہوئی۔

''تو مجھے کیا پڑی ہے کہ اس کی آنکھیں دیکھوں۔ اتنے سخت لہجے میں اس نے مجھے ڈانٹا کہ میں فوراً بھاگ آئی۔'' اس نے اپنی کارگزاری بتائی۔

''اچھا پھر اپنے پڑوسیوں کے گھر گئیں تم؟'' زارا کے لہجے میں بے صبری تھی۔ ''نہیں میں نہیں گئی۔ ثنا گئی تھی اور وہ لوگ بھی آئے تھے۔''

''ہائے وہ کون؟'' زوشاف شوخ ہوئی۔

''وہی اس زارا کے ذیشان سکندر کی آنکھوں والے۔'' وہ غصے میں الٹا سیدھا بول گئی۔

''کیا وہ بھی آیا تھا؟'' زارا کا اشتیاق قابل دید تھا۔

''جی نہیں ابھی میں نے ان موصوف کا دیدار نہیں کیا ہے۔ تم کہتی ہو تو جاؤں گی کسی روز۔ ویسے اس کی بہن سے بات کروں۔'' اس نے شرارت سے آنکھیں نچائیں تو زارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ثنا نے موی کے کمرے میں جھانکا۔ آج اس نے نائٹ بلب بھی نہیں جلایا تھا حالانکہ وہ اسے جلا کر سونے کی عادی تھی۔ اس نے نائٹ بلب جلا دیا۔ سائیڈ ٹیبل پر موی کی ڈائری کھلی پڑی تھی درمیان میں پین رکھا ہوا تھا۔ اس نے غور سے سوئی موی کی طرف دیکھا جس کے گالوں پر آنسو چمک رہے تھے۔ وہ مدھم روشنی میں ڈائری کے کھلے صفحات پر نگاہ دوڑانے لگی۔

''پپا کے لئے''

پیا نے کہا تھا میں ضرور آؤں گا

تمہارے ساتھ مل کر

برتھ ڈے کا گیت گاؤں گا

مگر!

وہ نہیں آئے اس بار بھی

کیک پر لگی ساری شمعیں

بجھ بھی گئی ہیں

کسی نے سالگرہ کا گیت بھی نہیں گایا

نہ میرا ماتھا چوما

نہ گلے لگایا

ثناء سے بقیہ نظم پڑھی ہی نہیں گئی۔ یہ موی نے اس وقت لکھی تھی جب وہ چوتھی کلاس میں زیرِ تعلیم تھی۔ اس وقت بھی فواد حسن کہیں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ آج موی کی سترہویں سالگرہ تھی۔ وہی نظم پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی تھی۔ اس کے کہنے پر راحت نے مسز شیر دل کو بھی نہیں بلوایا بس وہ تینوں ہی تھیں۔ کیک کٹتے ہی موی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ثناء کو پتہ تھا کہ آج وہ جی بھر کے روئی ہوگی فواد حسن کا فون بھی نہیں آیا تھا۔ شاید وہ اپنے بزنس میں مصروف تھے، موی کو دھچکا لگا تھا۔ اس کا کتنا جی چاہا تھا وہ بھی یہاں ہوتے، اسے سینے سے لگا کر ماتھا چومتے، دعائیں دیتے، وہ پرانی والی چھ سات سالہ موی بن کر ان کے سینے میں چھپ کر سینڈریلا کی کہانی سنتی۔ وہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے تو وہ یونہی سو جاتی۔ ثناء اس کی ڈائری رکھ کر مڑی۔ اس کا ماتھا چوما اس کا کمبل درست کیا جو ہمیشہ کی طرح آدھا اس کے اوپر اور آدھا نیچے پڑا تھا۔ سونے کے انداز سے بھی اس کی لاپروائی کا پتہ چلتا تھا ہلکے سے کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ باہر آ گئی راحت بھی جاگ رہی تھیں۔ ”روتے روتے سوئی ہے۔“ اس نے دھیرے سے ماں کو بتایا تو ان کا دل تڑپ اٹھا۔ ”امی سو جائیں آپ۔“ وہ نظریں چرا کر اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔

☆☆☆

”ہیلو سر میں سحرش بول رہی ہوں، ڈیفنس سے یہاں بلاک تھری اے ففٹی ٹو میں قتل ہو گیا ہے۔“ وہ پھولی پھولی سانسوں سمیت بتا رہی تھی۔

”کیا آپ نے خود قتل ہوتے دیکھا ہے؟“ دوسری جانب سے سوال کیا گیا۔

”جی ہاں! میرے سامنے قتل ہوا ہے۔ میں مسز شاہ رخ کی بھانجی ہوں کل ہی آئی ہوں۔ انکل نے آنٹی کو گولی مار کر لاش لان میں کیاریوں کے قریب دفن کر دی ہے۔ پلیز جلدی آئیں میں ان کے قتل کی عینی گواہ ہوں۔ ابھی تک انکل کو پتہ نہیں چلا ہے کہ میں نے ان کی یہ حرکت دیکھ لی ہے کیونکہ جب مجھے گولیوں کی آواز آئی تو میں سو رہی تھی گھبرا کر اٹھی تو دیکھا کہ بیڈ روم میں آنٹی کی لاش پڑی ہے اور......“ لڑکی بری طرح روئی۔

شیر افگن مسز شاہ رخ اور ان کے شوہر کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ان کے سامنے والے بلاک میں رہتے تھے اولاد نہ ہونے کے باعث دونوں میں جھگڑا بھی ہوتا رہتا تھا کیونکہ شاہ رخ کا ایک لڑکی سے چکر بھی چل رہا تھا۔

''محترمہ! آپ جھوٹ تو نہیں بول رہی ہیں کیونکہ ایڈونچر اور تھرلنگ کے شوقین نوجوان لڑکے لڑکیاں ایسی غلط اطلاعات دے کر انجوائے کر رہے ہیں۔'' شیر افگن نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔

''سر امیری آنٹی کا مرڈر ہو گیا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ جلدی آئیں ورنہ قاتل بھاگ جائے گا۔''

اس سے پہلے کہ وہ لڑکی کچھ اور کہتی دوسری طرف سے یوں لگا جیسے اس سے ریسیور چھین کر کریڈل پر پٹخ دیا گیا ہو۔ شیر افگن نے گھنٹی بجا کر کانسٹیبل کو بلایا اتفاق سے سمیر بھی آ گیا۔ شیر افگن نے اسے فوراً اس ایڈریس پر پہنچنے کی ہدایت کی۔ سمیر دو کانسٹیبلوں کو لے کر فوراً روانہ ہو گیا۔ شیر افگن سوچ رہا تھا کیا واقعی شاہ رخ نے اپنی بیوی کو مار ڈالا ہے۔ اس سے کچھ بعید بھی نہ تھا۔ ابھی گزشتہ ہفتے ہی پورے بلاک نے ان کی لڑائی دیکھی تھی۔ شاہ رخ نے بیوی کو مارنے کی دھمکی دی تھی۔

☆☆☆

راحت نے شرربار نگاہوں سے موی کو گھورتے ہوئے ریسیور کریڈل پر غصے سے پٹخا۔ کافی دیر سے وہ اس کی جھوٹی داستان سن رہی تھیں۔

''موی یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ بچوں کا ادارہ نہیں ہے۔ تمہیں علم ہے جھوٹی اطلاع دینے پر کیا ہو سکتا ہے؟'' وہ ان کی ڈانٹ سنتی رہی تنگ آ کر وہ چلی گئیں۔

موی چھت پر چڑھ گئی۔ پولیس جیپ شاہ رخ کے گیٹ کے آگے رکی۔ آفیسر چوکنا انداز میں اپنا پستول سنبھالے اترا۔ بے اختیار اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ آج اس نے ایک جاسوسی ناول میں اسی طرح کی کہانی پڑھی تھی جس میں ایک لڑکی پولیس کو گمنام کال کر کے جھوٹی اطلاعات دیتی تھی۔

موی نے جھٹ پولیس کا نمبر گھما ڈالا اور زبردست اداکاری کی جس کے صلے میں پولیس اب شاہ رخ کے گھر آئی ہوئی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد سمیر واپس آ گیا۔ شیر افگن تھانے میں ہی تھا آتے ہی سمیر نے ٹیبل کو ٹھوکر ماری۔

''خیریت!'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''پتہ نہیں ہماری عوام کو کیا ہو گیا ہے۔ ایڈونچر اور تھرلنگ کے کتنے غلط معنی لیتی ہے۔ ہونہہ بگڑی نسل۔'' اس نے ہونٹ چبا کر اپنا غصہ نکالا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ یہ جھوٹی اطلاع تھی۔

''ٹیک اٹ ایزی۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کی خاطر کبھی کبھی ہمیں اس طرح کی ناگوار باتوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔'' اس لمحے فون کی گھنٹی بجی، شیر افگن نے ہی اٹھایا۔

''ہیلو آفیسر! لاش مل گئی ہے ناں؟'' چہکتی آواز میں پوچھا گیا تو اس کا دل چاہا کہ کاش وہ سامنے ہوتی تو اس کا گلا دبا دیتا۔ شیر افگن نے زور سے ریسیور پٹخا۔ سمیر بتا رہا تھا۔

''جب ہم گئے تو مسٹر شاہ نے خود دروازہ کھولا میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر فوراً ملازموں کو بلانے لگے۔ مسز شاہ رخ بھی بھاگی بھاگی آئیں۔'' مارے خفت کے سمیر کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

ادھر موی ہنس ہنس کر فون پر دوستوں کو اپنی کارگزاری بتا رہی تھی۔ راحت قریب نہیں تھیں۔ شاہ پڑوسیوں کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ پلوشہ سے اس کی گہری دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں کی عادات یکساں تھیں اس لیے مل بیٹھ کر خوش ہوتیں۔ موی صرف ایک بار ان کے گھر گئی تھی۔ مسز شیر دل اور ان کے سسر سے گپ شپ لگا کر آ گئی تھی۔ پلوشہ ویسے بھی اس کی ہم عمر نہیں تھی۔ بہت ہی کم بولتی تھی جبکہ اسے زیادہ باتیں کرنے والے لوگ پسند تھے بقول اس کے کہ باتونی لوگ کھلی کتاب کی طرح ہوتے ہیں، مکاری نہیں ہوتی ان میں۔ خیر اس کا اپنا نظریہ تھا۔ وہ خود بہت بولتی تھی۔ دوست بھی اس طرح کی بناتی تھیں شوخ و ہنگامہ پرور روز نت نئے منصوبے بنتے جس کا مرکزی کردار موی خود ہی ہوتی۔ جاسوسی ناول پڑھ کر وہ خود کو بڑی عقلمند سمجھنے لگی تھی۔

''سمیر یہ تیسری کال ہے جس کے نتیجے میں ہم رسوا ہوتے ہوتے بچے ہیں۔ جس جگہ سے ہم ابھی ہو کر آ رہے ہیں وہ ایڈووکیٹ تھا۔ بڑی کھری کھری سنائی ہیں کہ جہاں قتل ہوتا ہے وہاں تو آپ پہنچتے ہی نہیں ہیں اور ایسی گمنام کالز پر دوڑے آتے ہیں۔'' سمیر واقعی غصے میں تھا۔

''چلو کرتے ہیں کچھ۔'' شیر افگن نے تسلی دی۔ یہ تو طے تھا کہ کال ایک ہی لڑکی کرتی تھی دو تین روز کے وقفے سے فون آتا کہ ڈیفنس کے فلاں بلاک میں قتل ہو گیا ہے، چوری ہو گئی ہے، اغواء ہو گیا ہے۔

''یقیناً فون کرنے والی کہیں آس پاس ہی رہتی ہے۔'' شیر افگن پر سوچ انداز میں بولا سمیر نے کوئی تبصرہ نہیں کیا وہ بڑا انجل ہوا تھا۔

☆☆☆

''ہیلو آفیسر! یہاں ڈیفنس میں دو قتل ہو گئے ہیں فوراً آئیں ورنہ قاتل بھاگ جائے گا۔'' شیر افگن نے آواز سے پہچان لیا تھا کہ وہی لڑکی ہے۔

''بی بی ہم کیسے آ سکتے ہیں۔ ایف آئی آر کے بغیر ہم قاتل کو گرفتار نہیں کر سکتے۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''اچھا کاٹیں ایف آئی آر۔''

''سوری! فون پر تو ایف آئی آر نہیں کاٹی جا سکتی اس کے لیے آپ کو تھانے آنا پڑے گا۔''

''مگر میں کیسے تھانے آ سکتی ہوں؟''

''تو پھر قاتل کو خود ہی گرفتار کر لیں۔'' اس نے مشورہ دے کر فون بند کر دیا چند سیکنڈ بعد پھر گھنٹی بجی۔

''دیکھیں میں آ رہی ہوں مگر مجھے بہت ضروری کام ہے زیادہ دیر رکوں گی نہیں آپ ایف آئی آر کاٹتے ہی روانہ ہو جائیں ورنہ قاتل بھاگ جائے گا۔ اگر اسے علم ہو گیا کہ اس کے قتل کا عینی گواہ موجود ہے تو وہ مجھے بھی قتل کر سکتا ہے۔'' لہجے میں بڑا خوف بھر کر کہا گیا۔ اسے واقعی ڈر لگ رہا تھا اگر اس کا پول کھل جاتا تو...... ویسے سابقہ تجربات نے اسے بے خوف بنایا ہوا تھا۔ وہ تھانے جا کر ایف آئی آر کٹوانے پر راضی ہو گئی تھی۔

جاسوسی ناولز کی ہیروئن تو بڑے آرام سے ان مشکلات سے بچ نکلتی تھی، وہ بھی بچ جائے گی۔ اس نے ہر زاویے سے جائزہ لیا تھا۔

''امی! میں پارک میں جا رہی ہوں۔'' اس نے کچن میں مصروف ماں کو اطلاع دی ویسے بھی پولیس اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ آدھے

گھنٹے میں فارغ ہو کر آسکتی تھی کسی کو پتہ ہی نہ چلتا۔ مرکزی گیٹ پر تعینات کانسٹیبل لڑکی کو سائیکل پر اسی طرف آتے دیکھ کر ذرا حیران ہوا۔ کیونکہ ادھر کم ہی عورتیں آتی تھیں کجا کہ یہ نوعمری لڑکی حلیے سے ہی سکول گرل لگ رہی تھی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ لڑکی سائیکل سے گیٹ کے آگے اتری۔

"السلام علیکم! میری سائیکل کا دھیان رکھیے میں ابھی آتی ہوں۔" موی نے بڑی تمیز سے سلام کیا تو خادم حسین نے خوشدلی سے سر ہلایا۔ وہ اندر آگئی۔ تھانے کی عمارت بڑی وسیع اور جدید طرز تعمیر کی آئینہ دار تھی لمبے سے برآمدے میں دیواروں کے ساتھ خوش رنگ پھولوں والے گملے پڑے ہوئے تھے۔ ایک سپاہی نے مطلوبہ کمرے تک اس کی رہنمائی کی۔

اندر جاتے ہوئے پہلی بار اسے ڈر سا لگا۔ ساری بہادری بھاپ بن کر اڑتی محسوس ہوئی۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں؟" بے اختیار سمیر چونکا۔ وہ دروازے کے سامنے ہی تھا۔ شیر افگن بھی متوجہ ہوا۔ یعنی شکار چارے پر منہ مارنے واقعی آ گیا تھا۔

"آئیے آئیے۔" سمیر اسے پہچان گیا تھا یوں لگا جیسے وہ اس سے گھر کے ڈرائنگ روم یا کلاس روم میں آنے کی اجازت مانگ رہی ہے۔ کافی فائل والی لاپرواہ سی لڑکی کو وہ بھولا نہیں تھا۔ شیر افگن نے سامنے کھلی فائل سے سر اٹھایا۔

"تو آپ ایف آئی آر کٹوانے آئی ہیں؟" وہ اس کے چہرے کو نگاہوں کی گرفت میں لیتا ہوا بولا تو موی کے ذہن میں کوندا لپکا۔ یہ وہی تھا جس نے سائیکل سے اس کی ٹانگ نکال کر ڈرا دیا تھا اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ غلط شخص کے پاس چلی آئی ہے۔ شیر افگن بھی اسے پہچان چکا تھا۔

"سمیر انہیں بٹھاؤ، خاطر مدارت کرو۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولتا اٹھ کھڑا ہوا۔ سمیر نے نگاہوں ہی نگاہوں میں رحم کی درخواست کی۔

"ہاں تو کچھ یاد ہے آپ کو کہ یہ کون سا واں قتل ہے جس کی اطلاع ہمیں دی جا رہی ہے۔" وہ بے پناہ سخت لہجے میں بولا تو موی کو یوں لگا کہ جیسے ابھی شامت آئی۔

"شاباش بولیے، کیسے قتل ہوا ہے یہ؟" وہ خاموش رہی۔ "معلوم ہے آپ کو کہ اس طرح کی غلط اطلاعات سے ہمارا کتنا وقت ضائع ہوتا ہے۔ میں آپ کے والدین کو بتاؤں گا کم از کم اپنی اولاد کی سرگرمیوں پر تو نگاہ رکھیں۔ شاباش اپنا ایڈریس بتائیے۔"

وہ خاموش رہی تو وہ دوبارہ دھاڑا "ہری اپ!"

وہ روبوٹ کی طرح بولتی گئی۔ شیر افگن حیران ہوا یہ تو عین ان کے ساتھ والا گھر تھا جس کے مکینوں کی تعریفیں اس کے تمام گھر والے کرتے تھے مگر ابھی تک اسے نئے پڑوسیوں سے ملنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔

"سمیر میں ابھی آ رہا ہوں۔" اس نے گاڑی کی چابی اٹھا کر موی کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔

اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ "دیکھیں ایم سوری...... میں آئندہ ایسے نہیں کروں گی۔ میری امی کو کچھ مت بتائیے وہ ہرٹ ہوں گی اور مجھے ڈانٹیں گی۔" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔ شیر افگن سر جھٹک کر جیپ کا دروازہ کھولنے لگا۔

"میری سائیکل باہر کھڑی ہے میں اس پر آ جاؤں گی۔" اس نے انکار کیا۔ شیر افگن گھوما اس کا بازو پکڑ کر آگے کیا، اسے بے پناہ ذلت محسوس ہوئی کیونکہ اس کی گرفت بہت سخت تھی۔

''سائیکل آپ کو مل جائے گی۔'' اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

موی خوفزدہ تھی نہ جانے امی نے اس کا کیا حال کرنا تھا۔ اس سے تو ذرا سی ڈانٹ بھی نہیں سہی جاتی تھی پھر یہ پولیس آفیسر تو واقعی پولیس آفیسر لگتا تھا۔ چہرے پر سختی، پتھریلے سے تاثرات۔ فولادی گرفت۔

''اتریے۔'' اس نے گھر کے آگے گاڑی روکی۔ اندر پلوشہ اور مسز شیر دل بھی موجود تھیں۔ ایسی ذلت کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

راحت وردی میں ملبوس مرد کے ساتھ موی کو دیکھ کر حیران ہوئیں۔ ثناء بھی نکل آئی۔ یقیناً سنگین معاملہ تھا۔ موی کا جھکا سر ہی ثبوت تھا۔

''السلام علیکم آنٹی! میں آپ کی صاحبزادی کو تھانے سے لایا ہوں۔''

''الٰہی خیر!'' راحت نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ مسز شیر دل کو آواز شیر افگن کی لگی۔ دونوں ماں بیٹی باہر آگئیں۔ شیر افگن نے سارا قصہ سنایا تو بعد میں تعارف ہوا کتنی بے عزتی ہوئی تھی اس کے سامنے کیا سوچتا ہوگا وہ۔ راحت نے اس کے سامنے ہی موی کو خوب ڈانٹا۔ سب کے سامنے ڈانٹے جانے پر بے اختیار اس کے آنسو نکل آئے۔ شیر افگن پندرہ منٹ بیٹھا راحت اور ثناء اس کے کردار کی پختگی کی قائل ہو گئیں بہر حال انہیں اس سے مل کر خوشی ہوئی تھی اور درو شے کے مقدر پر رشک سا آیا۔ ایسے مضبوط و ہونہار بیٹے تو قسمتوں والی ماؤں کا مقدر ہوتے ہیں۔ انہوں نے برملا اظہار کیا۔ ساتھ ہی موی کی بدتمیزیوں کا رونا رویا۔

''بچی ہے راحت بہن! ابھی عمر ہی کیا ہے۔ وقت کے ساتھ سنبھل جائے گی۔'' انہوں نے آزردہ سی راحت کا ہاتھ دبایا۔

''بھلا یہ کیسے سنبھل جائے گی اتنی سی لڑکی اور ہمت دیکھو تھانے پہنچ گئی۔ اگر شیر افگن کے بجائے کوئی اور ہوتا تو..... تھانوں کے ماحول سے آپ بھی واقف ہیں محافظ ہی لٹیرے بن جاتے ہیں۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں اس کے باپ کو کیا منہ دکھاتی۔'' وہ رو پڑیں۔ ''ثناء بھی تو ہے ناں۔ اس نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا۔ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار ہے۔ کاش تھوڑی سی عقل اللہ اسے بھی دے دے۔'' درو شے ہولے ہولے راحت کا ہاتھ تھپکنے لگیں ان کی پریشانی بجا تھی۔

رات ثناء، موی کو کھانے کے لیے بلانے گئی تو اس نے انکار کر دیا۔ فل آواز میں ڈیک لگا کر دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ صبح وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔ راحت اور ثناء کے ہاتھ پیر پھول گئے، غصے میں اسے ڈانٹ تو دیا تھا اب اس کی حالت دیکھ کر رو رہی تھیں۔ ثناء نے پلوشہ کو فون کر دیا۔ اس نے پندرہ منٹ میں اپنی فیملی ڈاکٹر کو بلا لیا کیونکہ ثناء، اور راحت کہیں بھی زیادہ آتی جاتی نہیں تھیں۔ ڈاکٹر کے کلینک کے بارے میں لاعلم ہی تھیں۔ وہ دونوں ماں بیٹی خود بھی ان کے گھر پہنچ گئیں۔ راحت موی کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھیں ثناء الگ پریشان تھی۔ کل ڈانٹ کھانے کے بعد اس نے پلٹ کر ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ دل ہی دل میں کھولتی رہی وہ بے پناہ حساس تھی سب کے سامنے اہانت کے تصور نے اسے مجروح سا کر دیا تھا۔

شیر افگن جلدی لوٹ آیا تھا۔ درو شے نے اسے بھی کہا کہ موی کو دیکھ آؤ۔ ماں کی ضد سے مجبور ہو کر وہ آ گیا تھا۔ ثناء نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد ماں کو اطلاع دی جو موی کے سرہانے بیٹھی سورتیں پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ ''ادھر ہی لے آؤ۔'' انہوں نے اشارہ کیا۔ موی کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور گالوں سے لڑھکتا تھوڑی پر ٹھہر گیا۔ راحت نے بے اختیار اس کا سر اپنی آغوش میں رکھ لیا۔

''موی! آئندہ نہیں ڈانٹوں گی، آنکھیں کھولو میری جان۔'' انہوں نے اس کا ماتھا چوما۔ شیر افگن یہ منظر دیکھ کر بہت متاثر ہوا اس نے

اشارے سے اس کی طبیعت کا پوچھا اسی وقت موی نے آنکھیں کھول دیں۔ راحت نے شکر ادا کیا۔

"بیٹا! تم بیٹھو میں شکرانے کے نفل پڑھ کر ابھی آتی ہوں۔ جانا نہیں۔ اب موی کو ہوش آ گیا ہے۔" انہوں نے پیار سے اس کا ماتھا چوما اور باہر چلی گئیں۔ موی بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی موجودگی اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" وہ...... بولا حالانکہ یہاں آنے کو اس کا دل ہرگز نہیں چاہ رہا تھا یعنی ایسی لاپروا لڑکی کی عیادت بھی کی جائے۔

"بالکل ٹھیک ہوں میں، کچھ نہیں ہونے والا ہمیں۔" وہ تلخی سے بولی اور کمبل پھینک کر اتر آئی۔ ثناء چائے لے کر آ رہی تھی۔

"رکو موی! آرام کرو۔" وہ ٹرے ہاتھ میں تھامے کھڑی رہ گئی۔ موی سائیڈ سے نکل گئی۔

"مس ثناء آپ مائنڈ مت کیجئے گا بے جا لاڈ پیار سے آپ نے اپنی بہن کو سر پر چڑھا لیا ہے تھوڑی سی سختی کریں ان کے اوپر۔" وہ سنجیدہ سی ثناء کو دیکھتے ہوئے بولا۔ دونوں بہنوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس نے کتنے سلیقے سے دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا، نشست و برخاست میں بھی رکھ رکھاؤ تھا۔ ہر جملہ سوچ سمجھ کر بولتی تھی۔ شیر افگن چائے پیتے ہوئے ثناء کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا جب وہ واپسی کے لیے نکلا تو موی لان میں ٹہل رہی تھی بھاگ کر اس کے پاس آئی۔

"میری سائیکل پہنچ جانی چاہیے۔" وہ تحکم سے بولی تو اسے بہت غصہ آیا۔

"وہ سامنے کھڑی ہے۔ کل رات کو چھوڑ گیا تھا میں۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکلتا چلا گیا۔ موی کے دل میں خواہش ابھری کہ کاش سائیکل کے بجائے اس کے پاس ٹرک ہوتا تو وہ اس مغرور سے شخص کو کچل دیتی پھر وہ اسے کبھی نہ ڈانٹتا۔

وہ صبح پیدل پارک میں چلی گئی۔ اکا دکا لوگ تھے۔ سردی کے باعث رونق ماند پڑ گئی تھی۔ اس کے سوا پارک میں اور کوئی لڑکی نہیں تھی بس وہ اکیلی ہی تھی۔ وہ الگ ہو کر ٹہلنے لگی۔ ایکسر سائز کرتے شیر افگن کو دیکھ کر اسے حیرت نہیں ہوئی۔ وہ بے نیازی سے درختوں کے پیلے پتوں کو دیکھ رہی تھی اسے اکیلے پا کر دو لڑکے قریب چلے آئے۔ دونوں اس سے تعارف حاصل کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ انہیں گھور کر شیر افگن کے آس پاس ٹہلنے لگی۔ انہوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

"پلیز اپنا نام تو بتا دیں۔" ایک نے فرمائش کر دی۔ وہ شیر افگن کے پاس چلی آئی۔

"دیکھیں یہ لڑکے مجھے تنگ کر رہے ہیں۔" وہ گھوما تب تک وہ رفو چکر ہو گئے تھے۔ موی بے اختیار کھلکھلائی وہ حیران ہوا مگر اس کی مسکراہٹ کا سبب نہیں پوچھا۔ وہ پھر دور ہٹ گئی اور کن انکھیوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"یقیناً بہت سی لڑکیوں کے ساتھ اس کے چکر ہوں گے اسی لیے تو ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔" شیر افگن واپس مڑ کر دوڑنا شروع ہو گیا۔ وہ بھی بڑبڑا کر اٹھی۔ سارا پارک خالی تھا۔

☆☆☆

پھر اسے پتہ بھی نہیں چلا اور وہ بند دروازے کھول کرول کے نہاں خانے میں روپوش ہو گیا۔ وہ اس کو نکالنے کی کوششوں میں بے حال ہو گئی خود کو ڈانٹا ملامت کی وہ اتنا سنجیدہ باشعور سا مرد ہے کبھی بھی اسے لفٹ نہیں کرائے گا۔ مگر ول نے ساری دلیلیں رد کر دیں۔

اس کی کھوئی کھوئی کیفیت دوستوں سے چھپی نہ رہ سکی۔ خود راحت اور ثناء اس میں تبدیلی محسوس کر رہی تھیں۔ کافی دنوں سے اس نے کسی جاسوسی ناول کو ہاتھ نہیں لگایا تھا نہ ٹی وی کو چھیڑا۔ اکثر وہ لان میں گھومتی نظر آتی۔ اس کا سبب انہوں نے باپ سے دوری کو قرار دیا۔ فواد نے بھی تو پلٹ کر ایک سال سے خبر نہیں لی تھی۔ موی کا یہ رویہ فطری تھا۔

اب وہ پلوشہ کی طرف بھی جانے لگی تھی۔ اس کے فائنل ایگزامز قریب تھے جس کے بعد اس کی شادی ہو جانی تھی۔ ثناء درو شے کے ساتھ بازاروں کے چکر لگا رہی تھی۔ ان کی دوسری رشتے دار خواتین بھی آ گئی تھیں۔ گھر میں چھوٹے موٹے میلے کا سا سماں تھا۔ موی کو یہ سب بہت دلچسپ لگ رہا تھا۔ آتے جاتے پلوشہ کی کزنز اسے چھیڑتیں تو پلوشہ کے چہرے پر کتنے رنگ بکھرتے تھے۔ موی بس دیکھے جاتی جیسے ہی وہ آخری پیپر دے کر آئی ثناء بھی چلی گئی۔ وہ اسے مایوں پر اوڑھنے والا دوپٹہ دے گئی تھی جس پر کرن لگانے کا کام اسے سونپا گیا تھا۔ موی پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ کل پلوشہ مایوں بیٹھ رہی تھی۔ ڈھیروں کام پڑے تھے۔ ثناء بھی شامل ہو گئی۔ موی تو بس ہاؤ ہو کر رہی تھی۔

پھر مایوں والے روز خوب دل لگا کر تیار ہوئی۔ ثناء سے ہلکا ہلکا میک اپ بھی کروایا۔ دونوں بہنیں بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ موی پیلے چوڑی دار پاجامے ہم رنگ قمیص اور بڑے سے دوپٹے میں اپنی عمر سے بڑی لگ رہی تھی۔ راحت نے اپنے سہارے والے جھمکے بھی اسے پہنائے تو سہانا روپ اور بھی کھل اٹھا۔ بالوں کو گھنگھروؤں والے پراندے میں جکڑے وہ بے پناہ خوش تھی۔ لڑکیاں دولہا والوں کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھیں اور پھولوں سے بھری طشتریاں ڈیکوریٹ کر رہی تھیں۔

موی کی بے تاب نگاہوں نے شیر افگن کو گھر بھر میں تلاش کر ڈالا، وہ کہیں نہیں تھا۔ وہ سمیر اور اپنے ایک کزن کے ساتھ بازار گیا ہوا تھا۔ پلوشہ کے لیے سجائی جانے والی چوکی کے لیے پھول خریدنے جو کم پڑ گئے تھے پھر خاصی دیر بعد اس کی واپسی ہوئی۔ پلوشہ نے موی کو اس کے کپڑے استری کرنے کو کہا تھا۔ ہنگامے میں کسی کو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ وہ آنٹی سے پوچھ کر اس کے کمرے میں آ گئی۔ جہاں بیڈ پر پیکٹ میں اس کے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے استری لگائی۔ آئرن اسٹینڈ باہر تھا وہ کارپٹ کے اوپر چادر بچھا کر کپڑے استری کرنے بیٹھ گئی۔

کلف لگے کپڑوں کو استری کرنا بھی مسئلہ تھا۔ خود اس نے تو اپنے کپڑے کبھی استری نہیں کئے تھے۔ ثناء، راحت یا ملازم ہی کرتا تھا۔ کھلے دروازے سے شیر افگن نے پہلے کپڑوں کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی کزن ہی ہو گی مگر اندر آ کر پتہ چلا کہ یہ تو موی ہے۔ وہ شلوار استری کر چکی تھی۔

”رہنے دیں میں خود کر لوں گا۔“ اس نے روکنا چاہا مگر وہ نہیں مانی پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے قمیص ایک جگہ سے اچھی خاصی جل گئی۔ وہ ہراساں ہو گئی سمیر بھی آ گیا۔ خوفزدہ ہو کر وہ باہر نکل گئی۔ ہر قدم پہ چھن چھن کرتی وہ سیڑھیاں اتر گئی، سمیر ہنس رہا تھا۔

”یہ وہی ہیں ناں فون والی۔“ وہ تجاہل عارفانہ سے بولا۔

"جی ہاں، پتہ نہیں کس احمق نے میرے کپڑے سارے استری کرنے کے لیے دے دیئے۔" وہ وارڈ روب کھولے دوسرے سوٹ دیکھ رہا تھا۔

"شیر! اس بے چاری لڑکی سے تو تمہیں خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہے۔ تم میں تو حس لطیف ہی نہیں ہے۔ بالکل عاری ہو اس چیز سے تم۔"

"ہاں تم درست کہہ رہے ہو، مجھے کیئرلیس لڑکیاں بالکل پسند نہیں ہیں۔ ان محترمہ سے تو اللہ بچائے۔ اتنی چھوٹی بھی نہیں ہیں، بڑی بہن صرف تین برس بڑی ہے مگر اس میں میچورٹی ہے۔"

شیر افگن نے بالآخر ایک سوٹ منتخب کر ہی لیا۔ سمیر لاپروائی سے میگزین دیکھنے لگا۔ شیر افگن پرفیوم کا اسپرے کرنے کے بعد گھوما تو سمیر نے بے اختیار اسے سراہا۔

"شیر! واقعی شیر لگ رہے ہو۔" اس کے تعریف کرنے کا اپنا اسٹائل تھا۔ وہ اس کا پورا نام لینے کے بجائے شیر کہتا تھا۔ یہ مخلص سا سمیر اسے بہت عزیز تھا۔

"اٹھو چلیں۔" شیر افگن اسے ساتھ لے کر نکل آیا۔ لڑکیاں ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ موی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ مرد اتنے دلکش سحر انگیز بھی ہو سکتے ہیں۔ باپ کے بعد وہ پہلا مرد تھا جس نے اس کے احساس کے تاروں کو چھیڑا تھا اس کا واسطہ زیادہ مردوں سے کبھی پڑا ہی نہیں۔ ہاں جب وہ ہائی کلاسز میں آئی تو اسے مرد ٹیچر زہی پڑھاتے تھے مگر شیر افگن جیسا مکمل مرد اسے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد موی نے اسے مکمل مرد کا خطاب دے کر پاس کر دیا تھا۔ ہر طرف سے آنکھیں بند کیے وہ اسے ہی سوچ رہی تھی۔ عمر کا یہ دور کتنا خطرناک ہوتا ہے، مومنہ حسن کو اس کا قطعی احساس نہیں تھا۔

پلوشہ کی رخصتی کے بعد کا پھیلاوا سمیٹنے کے لیے ثناء راحت کے کہنے پر یہیں رک گئی تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ سارے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد موی بالکل نہیں اکتائی تھی۔ درد سے کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ ثناء انہیں چائے کے ساتھ ڈسپرین دے کر آئی۔ شیر افگن کے کمرے کی طرف جانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے موی کو بلا لیا۔ وہ خوشی خوشی تیار ہو گئی۔ ثناء نے محسوس ہی نہیں کیا۔ شیر افگن کمرے میں اندھیرا کیے ایزی چیئر پر نیم دراز تھا۔ یہ بہنیں بھی کیا چیز ہوتی ہیں، پاس ہوں تو موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ دور جا کر رگ و پے کو دھڑکا کر رکھ دیتی ہیں۔ پلوشہ اس کی چھوٹی لاڈلی اکلوتی بہن جو وقت سے پہلے ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے بے دردی سے جلتی آنکھوں کو رگڑا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور کوئی اندر آ گیا۔ موی کا گھنگھروؤں والا پراندہ اور پازیب چھن چھن کرتی اس کے بالکل قریب آ کر رکی۔ اس کی لاپروائی کا وہی عالم تھا دوپٹہ پھندے کی طرح گردن میں لپٹا ہوا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اسے دوپٹہ سنبھالنے کی عادت نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ زیادہ تر جینز کے اوپر رنگ برنگی قمیص زیب تن کرتی تھی اور اسکارف مارے بندھے شانوں پر لٹکا لیتی ہاں مگر پلوشہ کی شادی میں وہ مکمل شلوار قمیص اور دوپٹے میں نظر آئی تھی۔

"یہ لیں چائے۔" اس نے نیم اندھیرے میں بیٹھے شیر افگن کی طرف گرم گرم چائے کا کپ بڑھایا۔ بے دھیانی میں کپ کے بجائے اس کے ہاتھ میں موی کی کلائی آ گئی اس کا پورا وجود آندھی کی زد میں آئے خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپا اور سارا کپ الٹ کر شیر افگن پر گرا۔ وہ اچانک اٹھا، اچھی خاصی جلن ہو رہی تھی خاص طور پر ہاتھ تو جھلس ہی گیا تھا وہ جلن برداشت کر گیا موی شرمندہ سی تھی۔

"اب جائیں اور چائے لانے کی زحمت مت کیجئے گا۔" وہ رکھائی سے بولا۔

"دیکھیں ایم سوری میری غلطی نہیں تھی۔ اصل میں......" شیرافگن شاید ایسی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا وہ لڑکی تو سر سے پیر تک نئے رنگوں میں ڈوب چکی تھی۔

☆☆☆

راحت نے مسز شیر دل سے شاہ کی کہیں بات چلانے کے لیے کہا تھا۔ فواد خود بہت پریشان تھے۔ رات جب وہ دونوں بہنیں سوئی ہوئی تھیں تو ان کا فون آیا تھا۔ شیرافگن کو دیکھ کر ان کے دل میں خواہش ابھری تھی کہ کاش یہ ان کی شاہ کا مقدر بن جائے۔ موی تو اس سے چھوٹی ہی تھی۔ شاہ اپنے قد کاٹھ اور بھرے بھرے جسم کے ساتھ اپنی عمر سے دو تین برس بڑی ہی لگتی تھی۔ اس کے مزاج میں سنجیدگی بھی تو بے انتہا تھی۔ ہاں اس کی خوبصورتی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ پلوشہ کی شادی میں کئی عورتوں نے اسے خیالوں میں اپنے بیٹوں کے ساتھ ملا کر دیکھا۔ بلکہ پلوشہ کی دو تین کزنز کو موی بھی بے حد پسند آئی تھی۔ کتنی شرارتی، زندہ دل اور ہنس مکھ تھی۔ صبوحی نے تو مذاق مذاق میں پلوشہ کو مشورہ دے ڈالا تھا کہ اسے اپنے بھائی کے لیے مانگ لو کم از کم مسکرایا تو کریں گے۔

"صبوحی! بھائی کو امیچور لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ پھر یہ خاصی چھوٹی بھی ہے۔ کہاں سوٹ کرے گی ان کے ساتھ۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"ہائے یہ تو نہ کہو اتنی پیاری لڑکی ہے۔ کیوٹ سی گڑیا جیسی۔" رومانہ سے برداشت نہیں ہوا تو بول پڑی۔

صد شکر کہ موی نے یہ تبصرے نہیں سنے وہ حسب معمول اپنے آپ میں مگن رہتی اسے امی کی پریشانی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ بس کلائی سے ایک خوشبو لپٹی رہتی جسے محسوس کرتے کرتے وہ نیند کی وادیوں میں اتر جاتی جہاں پھولوں سے بھرے سبزہ زاروں میں مست موسم میں شیرافگن اس کے ہمراہ ہوتا۔ وہ اس کے ساتھ دوڑتی چلی جاتی۔ بادلوں میں ڈولتی اسے کتنا شوق تھا کہ پہاڑوں پر دکھائی جانے والی روئی کے گالے چھوئے، پکڑے اور بالآخر اپنے آنچل میں گرہ لگا کر باندھ لے۔ خوابوں میں وہ دیکھتی کہ وہ بہت بلند جگہ کھڑی ہے۔ ایک ڈھلوان سی پہاڑی ہے اور وہ اس پر چڑھ کر بادلوں کو چھونے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے قدموں میں دھنک بکھری ہے۔ ان خوبصورت خوابوں کا عکس اس کے چہرے پر جھلک آتا۔ آنکھوں میں ستارے دمکتے، جگنو سے چمکتے۔ وہ پہلے بھی بہت ہنستی تھی مگر اب تو مسکان اس کے ہونٹوں سے جدا ہی نہیں ہوتی تھی۔

اقصیٰ نے ایک روز اس سے اگلوا ہی لیا اور پھر سب دوستوں کو بتا دیا۔ "دیکھا میں نہ کہتی تھی اس کی آنکھیں بہت تاثر انگیز ہیں اور اپنی موی ڈوب ہی گئی۔" زارا نے گردن اکڑائی سب بے فکرے گھروں کی کھاتی پیتی لڑکیاں تھیں جنہیں غم کا مطلب تک نہیں پتہ تھا۔ موی بھی تو اس کیفیت سے آشنا نہیں ہوئی تھی بس مسکراتی رہتی۔

☆☆☆

شیر دل خان کی سولہویں برسی تھی۔ پلوشہ کو رباز اور شیرافگن نے بمشکل چپ کرایا۔ یہی حال مما کا تھا جبکہ دادا ابو الگ اداس تھے۔ سولہ برس گزرنے کے باوجود بیٹے کی جدائی کا صدمہ کم نہیں ہوا تھا جبکہ شیرافگن نے خود کو خاصا کمپوز کیا ہوا تھا۔ آنکھیں ضبط کی شدت سے انگارہ بنی ہوئی تھیں۔

"بھائی جان وہ زندہ ہے آپ اسے کسی طرح ڈھونڈیں اور پھانسی کے تختے تک پہنچائیں تاکہ ہمارے سینوں میں سلگتی آگ ٹھنڈی ہو۔"

پلوشہ نے روتے روتے نڈھال انداز میں اپنا سر بھائی کی آغوش میں رکھ دیا۔

"دل تو میرا ابھی چاہتا ہے کہ اس کے پورے خاندان کو گولیوں سے چھلنی کردوں۔ موت کی نیند سلادوں تاکہ اس کی اولاد اور بیوہ ہمارے غم کو محسوس کرے۔ سولہ برس ہم نے جلتے ہوئے انگاروں پر چلتے گزارے ہیں۔ جس روز بھی مجھے کلیو ملا میں دن رات کا فرق بھلا کر کام کروں گا اپنے باپ کے قاتل کو پھانسی کے تختے پر دیکھنا میری بھی آرزو ہے۔" پھر اس رات شیر افگن ساری رات جاگتا رہا بلکہ اس گھر کے باقی تینوں فرد بھی ایک پل کے لیے نہ سو سکے۔

"آج سے سولہ برس پہلے گھر میں شیر دل کی گولیوں سے چھلنی لاش آئی تھی۔ اس وقت وہ کوئٹہ میں رہتے تھے۔ دادی جان تو جوان جہان بیٹے کو مردہ دیکھ کر خود بھی حوصلہ چھوڑ گئیں۔ صبح دو جنازے اٹھے ایک شیر دل اور دوسرا اس کی ماں کا۔ شیر افگن میٹرک کا طالب علم تھا۔ باپ کی شہادت نے دونوں بہن بھائیوں کو بے پناہ سنجیدہ اور محتاط بنا دیا تھا۔ سات آٹھ سالہ پلوشہ تو اونچی آواز میں ہنستی تک نہ تھی خود درو شے کو ہر وقت فکر رہتی جیسے یہ بچے بھی شیر دل کی طرح ان سے چھن جائیں گے۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے پھرتی رہتیں۔ سنگین خان کو چپ لگ گئی تھی کچھ عرصہ بعد وہ کراچی چلے آئے۔ سنگین خان نے بڑے چاؤ سے شیر دل کے بیوی بچوں کے لیے "شیر دل ہاؤس" بنوایا اب ان کا جینا مرنا ان کے ساتھ تھا۔ شیر افگن باپ کی طرح پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہی گیا۔ پلوشہ بھی اپنے گھر کی ہوگئی تھی۔ اب شیر افگن کا مسئلہ تھا۔ اس حادثے نے اسے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ وہ سرد مزاج سا ہوگیا تھا۔ اس کے ہم عمر دوسرے کزنز دو دو بچوں کے باپ بھی بن گئے تھے۔ اس نے ابھی تک لڑکی پسند نہیں کی تھی۔ درو شے کو یقین تھا کہ اس گھر میں شیر افگن کے حوالے سے آنے والی لڑکی اسے بدل ڈالے گی۔

انہوں نے ثناء کے حوالے سے اس سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"مما یہ آپ کیا کررہی ہیں، میں فی الحال اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"تو میں کونسا ابھی کہہ رہی ہوں۔ وہ بھی پڑھ رہی ہے۔ ایک سال کے بعد شادی کریں گے تب تک تم بھی خود کو تیار کرلو۔"

"آپ نے ان لوگوں سے کوئی بات تو نہیں کی ہے۔" وہ متفکر نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"نہیں۔" انہوں نے مختصراً جواب دیا۔

"تو پلیز ابھی کوئی بات مت کریں۔ کم از کم چار چھ ماہ تک بالکل نہیں۔"

"افگن کیا خوشیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں۔ کب تک تم خوشیوں کے لیے ہمیں ترساتے رہو گے۔ میں بہت اکیلی ہوں۔ پلوشہ کے بعد ان درو دیوار کی تنہائی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اپنا نہیں تو میرا خیال کرلو۔" وہ اچانک ہی بکھر گئیں۔ شیر افگن گھبرا گیا۔

"ٹھیک ہے مما! آپ جو چاہیں کریں۔" اس نے بلا مشروط ہتھیار ڈال دیے۔ جانتا تھا اس کی ماں ضبط کی انتہا پر ہی بکھرا کرتی ہے۔

☆☆☆

"راحت بہن! فواد صاحب کب تک آئیں گے؟" وہ اس سوال پر چونک گئیں۔

"کچھ پتہ نہیں انہوں نے کمپنی کی ایک برانچ بینکاک میں کھولی ہے۔ نیا نیا معاملہ ہے وہ اتنی جلدی نہیں آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے ان کے آنے پر سارے معاملات طے ہو جائیں گے میں آپ سے اپنے بیٹے کے لیے شاہ بیٹی کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔"

راحت کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ بے شک اوپر والا بڑا بے نیاز تھا۔ انہوں نے جو سوچا وہی ہو گیا۔ دروشے بات ان کے کان میں ڈال گئی تھیں۔ راحت نے اسی روز فواد کو فون کیا۔ فواد نے دروشے کو فون کیا وہ بے پناہ خوش تھے۔ بہت بڑا بوجھ جیسے سر سے ہٹ گیا تھا۔ موی کے لیے بھی اب انہوں نے سوچنا تھا فواد کے آنے پر منگنی اور پھر شادی کا پروگرام تھا۔ دروشے کے تمام خاندان کو خبر ہو گئی تھی۔ شیر افگن کی خالائیں بہت خوش تھیں۔ پلوشہ شاہ کو چھیڑتی تو اس کے مسکراہٹ سے نا آشنا لب مسکرا اٹھتے۔ ان سارے ہنگاموں میں ایک وجود ایسا بھی تھا جو چپ چاپ اپنی کھودی قبر میں دفن ہو گیا۔ کالج سے آتے ہی موی اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیتی اور پھر شام کو نکلتی پھر سات بجے سے بھی پہلے وہ دوبارہ کمرہ نشین ہو جاتی۔

چلو تم کو بتاتے ہیں

کہ تم کو دیکھ کر دل نے

کہا تم رشتہ جاں سے بھی بڑھ کر ہو

دعا کی سرحدوں پر

جو ادھوری ہے ایسی تمنا ہو

میرے دل کا مقدر ہو

کہ تم اک روشنی بن کر / شفا لے کر

کسی دست مسیحا کی طرح

اترے ہوئے ہر زخم جاں پر ہو

چلو تم کو بتاتے ہیں

کہ تم ایماں ہمارا ہو

سرائے دہر میں اندیشۂ زندگانی میں

تمہی دل کا سہارا ہو

جو روح کے آسماں پہ جگمگایا ہے محبت سے

سہانی شام کی چاہتوں کا پہلا تارا ہو

وفا کا استعارہ ہو

تمہارے قرب کی خوشبو سے پتھر کی طرح ہم نے
سلگتی دھوپ میں پھیلاؤ پایا ہے
تمہارے پیار کے رنگین کنول ٹھنڈی ہوا سے سرسراتے ہیں
کہ ہم ساون میں بھیگے پیڑوں کو چھو لیں تو
تمہارے لمس کی خوشبو کے لمحے جگمگاتے ہیں
چلو تم کو بتاتے ہیں
کہ ہم نے زندگی کے سب ورق لے کر
سبھی سطروں میں لکھ لی ہے تمنا تم کو پانے کی
زمانے بھر میں شاید کاتب تقدیر کے ہاتھوں
مرے دل نے لکھ لی ہے تمہاری چاہ کی خواہش
تمہاری آرزوؤں کا جو اک ادراک ہے۔ مجھ میں
کسی میں ہو نہیں سکتا
تمہاری مسکراہٹ کا جو اک ارمان ہے مجھ میں
کسی میں ہو نہیں سکتا
چلو تم کو بتاتے ہیں
چلو تم کو بتاتے ہیں

مگر اسے کچھ بتانے سے قبل ہی خوابوں کے تمام سلسلے جھٹکے سے ٹوٹ گئے تھے۔ بھلا اس کا اس سے کیا رشتہ تھا جو اس نے کچی سوچوں میں اسے بھر لیا تھا۔ وہ اس کے لیے تھا ہی نہیں تو وہ اس کے لیے کیوں سوچتی رہی تھی۔ ثناء کی آنکھوں میں جگنو بکنے لگے تھے۔ بلوشہ کی چھیڑ چھاڑ سے اکثر اس نے اس کے رخسار سرخ ہو کر دہکتے دیکھے تھے۔ ثناء نے اب ان کی طرف جانا کم کر دیا تھا جب بلوشہ رہنے کے ارادے سے آتی تو وہ تب جاتی۔ وہ اسے گھنٹوں بٹھائے رکھتی۔

☆☆☆

مجھ کو اک دن
اجنبی آنکھوں کی خاموشی نے
سمجھایا کہ

منہدم ہوتے ہوئے

خوابوں کی دلداری کبھی اچھی نہیں ہوتی

''موی بڑی چپ چپ ہو، کالج میں کسی سے لڑائی تو نہیں ہوئی ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے کروٹ بدلی۔ راحت کو آج اس پر بہت پیار آ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس ہی لیٹی ہوئی تھیں۔

''امی میں پپا کے پاس بنکاک چلی جاؤں۔ ان سے کہیں ناں وہ مجھے بلوالیں۔'' یہ نیا کیڑا اس کے دماغ میں کلبلایا۔

''جانو شاہ کی شادی کے بعد ہم جائیں گے۔'' امی نے کہا اف اس کا دل سکڑ گیا تب تک اذیت برداشت کرنی ہے۔

☆☆☆

درِ وشے آج زبردستی موی کو لے آئی تھیں۔ سنگین خان اسے بہت دنوں سے یاد کر رہے تھے وہ چہرہ ہی نہیں دکھاتی تھی۔

''آتی جاتی رہا کرو تمہیں دیکھ کر زندگی سے پیار ہونے لگتا ہے۔'' وہ محبت سے اسے پاس بٹھاتے ہوئے مسکرائے۔

وہ دعا کر رہی تھی کہ شیر افگن ابھی نہ آئے۔ اس کے آنے سے پہلے پہلے وہ جانا چاہتی تھی۔ مگر درِ وشے اسے شیر افگن کے والد کے بارے میں بتانے لگیں۔ پہلی بار اسے یہ حقیقت معلوم ہوئی تھی۔ اسے واقعی بہت دکھ محسوس ہوا۔ شیر افگن بھی آ گیا۔ اس نے کئی بار اجازت لینی چاہی مگر دادا ابا نے اسے روک لیا۔ وہ بہت بیزار لگ رہی تھی۔ سنگین خان واش روم میں وضو کرنے گئے تو شیر افگن نے واضح طور پر اس کی بیزاری نوٹ کی۔ اس کی آنکھیں اور پیشانی دیکھ کر بار بار ایک خیال ذہن کے دریچوں پہ دستک دیتا وہ اسے وہم سمجھ کر جھٹک دیتا۔

آج کل وہ بڑی سنجیدگی سے پرانے کیس کو دیکھ رہا تھا جو سولہ سال پہلے فائلوں میں بند ہو گیا تھا۔ اس تمام عمل کے دوران وہ اپنے ہر ممکن وسائل کو بروئے کار لایا تھا۔ سمیر اور رحمٰن مرزا اس کی بھرپور مدد کر رہے تھے۔ وہ انہی کی طرف سے ہو کر آ رہا تھا۔ رحمٰن مرزا تیں پینتیس سال سے صحافت سے وابستہ تھے۔ اپنے کام کے دھنی اور پورا پورا انصاف کرنے والے۔ انہوں نے اسے گزشتہ سولہ سال کا تمام قابل ذکر اخباری مواد فراہم کیا تھا۔ سولہ برس پہلے اس واقعے کی بڑی دھوم مچی تھی۔ اخبارات نے خصوصی فیچر چھاپے تھے۔ آہستہ آہستہ گرد بیٹھ گئی تھی۔ شیر افگن نے احتیاط سے متعلقہ تصاویر اور ریکارڈ ایک فائل میں محفوظ کر لیا تقریباً سارا دن آج اس نے اخبار کے دفتر میں گزارا تھا۔ بڑی عرق ریزی اور باریک بینی سے اس وقت کے اخبارات کو پڑھا اسے چونکا دینے والی خبر معلوم ہوئی کہ جلیل عرف جیلا کی ایک بیٹی ہے اس کی ایک دھندلی سی تصویر بھی شائع ہوئی تھی جو تقریباً ایک ڈیڑھ سال کی بچی کی تھی۔ کافی حد تک اس کے نقش و نگار اپنے باپ سے ملتے تھے۔ اس نے جلیل اور بچی کی تصویر سامنے رکھ کر کافی دیر موازنہ کیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اب وہ ساڑھے سترہ سال کی ہو گی۔ اس عرصے میں اس میں کافی تبدیلی آئی ہو گی۔ وہ مل بھی جاتی تو اسے کیسے پہچان پاتا۔ تازہ اطلاعات کے مطابق جلیل زندہ تھا اور روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ شاید اس نے نام بھی بدل لیا ہو اور حلیے میں بھی تبدیلیاں کر لی ہوں۔ سولہ سال ویسے بھی کسی انسان کو بدلنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔

شیر افگن نے احتیاط سے اس بچی کی تصویر کاٹ لی تھی اب واپس آ کر جونہی اس کی نظر موی پر پڑی جھٹ اس کا ذہن اس تصویر کی طرف

گیا۔اس کی آنکھیں اور پیشانی ہو بہو جلیل عرف جیلا کی طرح تھیں۔ایک رنگین میگزین میں اس کا کلوز اپ شائع ہوا تھا وہ بھی اس کے پاس محفوظ تھا۔

''مومنہ! آپ کے پپا کب سے بنکاک میں ہیں۔''اس نے پوچھا۔

''تقریباً ڈیڑھ سال سے۔''وہ حیران ہوئی آج سے پہلے تو اس نے ایسا کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔

''شاہ آپ کی سگی بہن ہے؟''

''بالکل سو فیصد۔''نہ جانے کیوں اس بے تکے سوال پر اسے غصہ آ گیا۔

شیر افگن نے سمیر سے بھی اس کا ذکر کیا۔

''یار! یہ محض اتفاق ہو سکتا ہے میں اسے نہیں مانتا۔سولہ برس پہلے کی ایک تصویر کو تم جوان لڑکی سے کیسے ملا سکتے ہو۔ویسے بھی یہ دو بہنیں ہیں۔اخبارات اور دوسرے ریکارڈز کے مطابق جلیل کی صرف ایک بیٹی تھی جبکہ یہاں تو موی کی ایک بڑی بہن بھی ہے۔ریکارڈ کے مطابق تو جلیل کے گھر بچی کی پیدائش دس جون سن اکیاسی میں ہوئی تھی جبکہ میرے خیال کے مطابق شاہ کم از کم مومنہ سے پانچ برس بڑی ہے۔تمہارے مفروضات غلط ہیں۔''سمیر نے بے رحمانہ تجزیہ کیا۔

''سمیر! ہو سکتا ہے شاہ ان کے کسی رشتے دار کی بیٹی ہو۔''

''مگر میرے بھائی آنٹی راحت اور فواد صاحب کا اس بھری دنیا میں ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں ہے۔''

''دیکھو میری جگہ رکھ کر خود کو سوچو بیٹی کی بات پکی ہونے والی ہے۔باپ ہے کہ بینکاک سے آ ہی نہیں رہا ہے۔آخر اسے کیا مجبوری ہے اکیلی بیوی اور بیٹیوں کو چھوڑ کر پردیس میں پڑا ہوا ہے یہاں کرائے پر سپر لگژری بنگلہ دلوایا ہوا ہے جب سے وہ لوگ یہاں آئے ہیں میں نے فواد صاحب کی شکل نہیں دیکھی ہے۔''

''اس کا ایک حل ہے تم ان کے گھر جاؤ اور کہو کہ میں اپنے ہونے والے سسر کی تصویر دیکھنا چاہتا ہوں۔''سمیر نے چھیڑا۔

شیر افگن نے اس کی شرارت سے قطع نظر سنجیدگی سے اس پوائنٹ پر سوچنا شروع کر دیا۔دوسرے روز وہ آنٹی راحت کے گھر پہنچ گیا۔شاہ اور وہ بازار گئی ہوئی تھیں موی البتہ گھر میں تھی۔وہ آج تیسری بار ان کے گھر آیا تھا۔موی نے اسے ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا۔باتوں باتوں میں شیر افگن نے ان کی فیملی کی تصویریں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔وہ پس و پیش کئے بغیر البم اٹھا کر لے آئی۔

شیر افگن نے شروع سے آخر تک تمام البم دیکھ لیا فواد کی تصویر کہیں نہیں تھی۔

''انکل کی تصویریں بھی دکھائیں ناں۔''وہ سرسری لہجے میں بولا۔

''اصل میں پپا نے اپنی ساری تصویریں پھاڑ دی ہیں۔انہیں شوق نہیں ہے۔''اس نے سادگی سے بتایا اس کے کمرے سے نکلتے ہی شیر افگن نے البم میں سے موی کی دو تین تصویریں نکال کر چھپا لیں گھر آ کر اس نے اخباری تصویر سے تین، سات اور نو سال کی تصویروں کو ملایا۔پیشانی اور آنکھیں چاروں تصویروں میں مشترک تھیں۔اس نے چاروں تصویریں سمیر کے سامنے رکھ دیں۔وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔دونوں رحمان

مرزا کے دفتر چلے آئے۔

''انکل! مجھے اس تصویر کی اوریجنل کاپی چاہئے۔'' اس نے اخبار سے کاٹی تصویر ان کے سامنے رکھی۔

''بیٹا! یہ فیچر ظفر عاصم نے لکھا تھا۔ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس نے جان پر کھیلتے ہوئے یہ تصویر حاصل کی تھی۔ اسی تصویر کی وجہ سے اس کی جان گئی اسے قتل کرنے سے پہلے جلیل سے متعلقہ ایک ایک چیز کو جلا دیا گیا تھا اس لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ قتل کے بعد جلیل اندرون پشاور روپوش ہو گیا تھا۔ تم وہاں سے مدد حاصل کر سکتے ہو قصہ خوانی بازار میں نصر قریشی ہے تم اس سے میرا نام لے دینا، وہ جو کچھ ہو سکے گا کرے گا۔'' انہوں نے اسے نئی راہ دکھائی۔

شیر افگن دو دن کی چھٹی لے کر فوراً پشاور چلا گیا۔ نصر قریشی اسے ایک دھیڑ عمر پٹھان کے پاس لے آئے تھے جو صدر روڈ کے پاس رہتے تھے۔

''پندرہ ساڑھے پندرہ سال پہلے اس شکل کا ایک آدمی ہمارے مکان میں بطور کرائے دار آیا تھا۔ اس کی ایک بچی بھی تھی کوئی ڈیڑھ دو سال کی مگر ایک ماہ کے اندر اندر وہ مکان چھوڑ کر چلا گیا حالانکہ اس نے چھ ماہ کا ایڈوانس بھی جمع کرایا تھا، لیے بغیر چلا گیا عجیب آدمی تھا۔''

''آپ کو پتہ ہے پھر وہ کہاں گیا؟''

''نہیں بھئی، وہ راتوں رات چلا گیا تھا سامان بھی چھوڑ گیا تھا۔''

خان صاحب نے جو کچھ بتایا اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا وہ بے نیل و مرام لوٹ آیا اب اس کے پاس ایک واحد راستہ رہ گیا تھا۔

''مما میں دو ماہ کے اندر اندر شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' رات اس نے درد شے سے کہا۔

''کہاں تو تم دامن بچا رہے تھے اور اب دو ماہ کے اندر.....'' انہوں نے بیٹے کو چھیڑا۔ ''ٹھیک ہے میں کل راحت سے تذکرہ کرتی ہوں۔''

رات اسے بڑی پرسکون نیند آئی تھی۔

☆☆☆

''فواد میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ فوراً آئیں کہ لوگ دو ماہ کے اندر اندر شادی کرنا چاہتے ہیں اس موقع پر آپ کا موجود ہونا ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ انہیں کسی قسم کا شک ہو جائے۔'' وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے میں زبیر سے مشورہ کرنے کے بعد آنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''آپ کو کوشش نہیں کرنی ہے ہر حال میں آنا ہے بلکہ اسے بھی لے آئیں تاکہ دیکھ لے ہم نے پل پل جیتے مرتے کتنی سزائیں کاٹی ہیں۔'' راحت کا لہجہ بھیگ گیا۔ فواد نے انہیں تسلی دے کر فون بند کر دیا۔

اسی ہفتے فواد آرہے تھے۔ شیر افگن بے چینی سے منتظر تھا۔ وہ خود ائیر پورٹ پر انہیں ریسیو کرنے والوں میں شامل تھا۔ انہیں دیکھتے ہی وہ چونکا اور گہری نگاہ سے فواد حسین کا جائزہ لیا۔ ان سے ملتے ہی وہ فوراً واپس پہنچا ان کی تصویر نکال کر مارکر سے قلمیں موٹی کیں، آنکھوں پر گلاسز کا اضافہ کیا، رخساروں کی ہڈیاں چوڑی کیں، اب جو تصویر بنی وہ ہو بہو ائیر پورٹ سے باہر آنے والے فواد حسن کی تھی شک کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے آئی جی کو فون کر کے آگاہ کیا انہوں نے اسے اپنے آفس آنے کی ہدایت کی۔

''تم نے کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اپنے باپ کے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پورا پورا بندوبست کیا ہے۔ کامیابی کی صورت میں پروموشن ڈن سمجھو۔''

''سر کوشش کریں کہ اخبار والوں کو اس معاملے کی بھنک نہ پڑے ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا تم فکر مت کرو اب تم آرام سے اپنا کام کر سکتے ہو میں تمہیں اس کام میں مکمل اختیار دے رہا ہوں۔'' انہوں نے اسے یقین دلایا۔ اسے معلوم تھا کہ اب منزل دور نہیں ہے۔

☆☆☆

''زبیر بہت بری خبر ہے مجھے شک ہے کہ شیر افگن شیر دل کا بیٹا ہے۔''

''تمہیں کیسے علم ہوا کہ ایسا ہے۔''

''ذرا یاد کرو جب شیر دل کا قتل ہوا تھا تو اس کے بیٹے کی تصویر اخبار میں چھپی تھی۔ اس نے ارادہ ظاہر کیا تھا کہ وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد پولیس ڈیپارٹمنٹ میں آئے گا۔ زبیر تمہارا ہونے والا داماد ڈی ایس پی ہے اور اتفاق سے اس کا نام بھی شیر افگن ہے۔''

''تم نے ائیر پورٹ سے اپنا تعاقب تو ہوتے نہیں دیکھا۔''

''سچ تو یہ ہے کہ میرا دھیان کہیں اور تھا۔''

''اچھا شیر افگن کے انداز میں تم نے کوئی غیر معمولی بات تو نوٹ نہیں کی ہے۔''

فواد نے سوچ کر جواب دیا جو کافی پریشان کن تھا۔

''بیٹا! یہ تم کس انداز میں آئے ہو اور یہ باقی لوگ ان کا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟'' راحت شیر افگن کے ساتھ پانچ چھ وردی میں ملبوس

سپاہیوں کو دیکھ کر لڑکھڑا گئیں۔

''مسز جلیل کھیل ختم ہو چکا ہے۔ ہم جلیل عرف جیلا کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ آپ کا تو خیال یہی ہو گا ناں کہ سولہ سال پرانا کیس دوبارہ کیسے کھل سکتا ہے۔ میں شیر دل کا بیٹا ہوں ڈی آئی جی شیر دل کا بیٹا۔'' اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

موی وہیں پتھرا گئی۔ ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میرے میاں تو فواد حسین ہیں۔''

''نام بدلنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ زاہد تم گیٹ پر اندر کی طرف کھڑے ہو جاؤ دو لوگ برآمدے میں چلے جائیں۔ ایک اوپر جائے، میں ادھری ہوں۔'' اس نے ماتحتوں کو ہدایت کی۔

''مسز جلیل شرافت سے بتا دیں کہ ثناء کس کی بیٹی ہے؟'' وہ درشتی سے بولا اس کے لہجے سے گزشتہ ادب و احترام غائب ہو چکا تھا۔

''میری بیٹی ہے اور کس کی بیٹی ہے۔''

''مت جھوٹ بولیں۔'' وہ دھاڑا۔ موی بری طرح سہم گئی تھی۔ اس نے راحت کو دونوں بازوؤں سے جکڑ رکھا تھا۔ ثناء کونے میں کھڑی تھرتھر کانپ رہی تھی۔

''ثناء ٹیک اٹ ایزی آپ کو کچھ نہیں ہو گا میں تو اپنے باپ کے قاتل کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔ آپ محفوظ ہیں، ڈونٹ وری۔'' اس نے بھاری ہاتھ اس کے شانے پر رکھتے ہوئے اسے تسلی دی۔ وہ بے چینی سے راحت اور موی کو دیکھ رہی تھی۔ فواد حسن تھوڑی دیر پہلے ہی بازار گئے تھے جانے سے پہلے ان کا کوئی فون آیا تھا جسے سن کر وہ خاصے پریشان ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ فون کس کا تھا۔

''ثناء آپ مجھے بتا دیں کہ آپ کا باپ کون ہے؟'' وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

''فواد حسن میرا باپ ہے۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولی۔

''خیر نہ بتائیں میں پتہ چلا لوں گا۔'' گزرنے والا ہر سیکنڈ موی اور راحت کو چلے جا رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا کاش یہ منحوس دن ان کی زندگی میں نہ آتا۔ شیر افگن کی نفرت ان دونوں سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ فون کی گھنٹی دوبارہ بجی اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔

''او نو۔'' شیر افگن کے منہ سے نکلا۔ وہ بھاگتا ہوا باہر نکلا اس نے سپاہیوں کو بھی روانگی کا حکم دیا۔ آناً فاناً وہ جیپ اسٹارٹ کر کے نکل آیا۔ اک بار پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ راحت نے تھکے تھکے انداز میں ریسیو کیا اور بولے بغیر سنتی رہیں۔

''ثناء تم فوراً پچھلے گیٹ سے نکل جاؤ۔'' انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔

''نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ ابھی شیر افگن آتا ہو گا نہ جانے وہ کیوں چلا گیا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھاؤ اگر حقیقت کھل گئی تو پتہ نہیں کیا ہو۔''

''آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔''

''نہیں میں نہیں جاتی۔ یہاں رہ کر فواد کا بلکہ جلیل کا انتظار کروں گا۔ خدا کے لیے چلی جاؤ۔''

ثنا نے الوداعی نگاہ راحت اور موی پر ڈالی اور بھاگتی ہوئی عقبی گیٹ پر پہنچی جہاں گاڑی میں اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ اسی لمحے اگلے گیٹ سے ایک گاڑی اندر داخل ہوئی۔ شیر افگن اسٹریچر اتار رہا تھا۔

اس نے لاش پر سے چادر اتار دی۔ راحت تیورا کر گریں۔ فواد کا جسم اپنے ہی خون میں نہایا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ان کا سارا بنگلہ لوگوں سے بھر گیا۔ فوٹو گرافر دھڑا دھڑ تصویریں اتار رہے تھے۔ موی کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔

''سنا ہے کہ دہشت گردوں نے یہ حشر کیا ہے۔''

کوئی دوسرا بولا۔ ''نہیں اسے اس کے پارٹنر نے گولی ماردی ہے تاکہ سارا مال اکیلے ہضم کرلے۔''

موی پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ رات کو باپ کا جنازہ اٹھایا گیا۔ صبح ماں کا تیار تھا وہ بے ہوشی کے عالم میں ہی بے جان ہو گئی تھیں۔ شیر افگن کو تیسرے روز ثنا کی غیر موجودگی کا احساس ہوا وہ دندناتا موی کے پاس آیا۔

''ثنا کہاں ہے؟'' وہ چپ رہی۔

بنگلے کے مالک نے تمام لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے موی کو فوراً گھر چھوڑنے کا نوٹس دے دیا تھا۔ اس عالم میں دروشے سنگین خان سے مشورہ کر کے موی کو اپنے گھر لے آئیں حالانکہ پلوشہ اور شیر افگن نے شدید مخالفت کی تھی۔

''مما یہ ہمارے باپ کے قاتل کی بیٹی ہے۔ یاد کریں ہم ان کے بغیر کیسے تڑپے ہیں۔''

''ابھی تو اس کے والدین کی لاشیں اٹھی ہیں۔ چالیسویں تک مجھے کچھ سوچنے کا موقع تو دو، ویسے بھی قدرت کی طرف سے انصاف ہو چکا ہے ہمیں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ رسان سے بولیں۔

موی کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ ایک قاتل، فراڈ اور ڈکیت شخص کی بیٹی تھی باپ بھی ایسا جس کی موت عبرت کا نشان بن گئی تھی۔ ماں شاید بہت کمزور دل تھیں یہ صدمہ سہار ہی نہیں سکی۔ ہاں ایک وہ رہ گئی تھی۔ قدرت نہ جانے اسے کیا کیا دکھانے والی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ثنا کو گھر سے کیوں زبردستی بھیجا گیا۔

''میں گھر سے اسے کیسے نکال دوں باہر بھوکے بھیڑیے تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ادھیڑ ڈالیں گے اسے، اتنی معصوم ہے یہ، پھر اس کا تو قصور بھی نہیں ہے۔'' دروشے بہت دلسوزی سے کہہ رہی تھیں۔

''پھر کس حیثیت سے آپ اسے گھر میں رکھیں گی؟'' پلوشہ زہر آلود لہجے میں بولی۔

''بہو کی حیثیت سے۔'' ان کی آواز سے ایک دم سناٹا چھا گیا۔

''ہاں یہ ٹھیک کہہ رہی ہے ہم دونوں نے بہت سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ شیر افگن ہماری بات ٹالے گا نہیں۔'' سنگین خان مضبوط لہجے میں بول رہے تھے۔

''دادا ابو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بھائی جان کی شادی ثنا سے ہو گی۔'' پلوشہ انہی کی پوتی تھی۔

"ثناء یہاں نہیں ہے۔ مجھے شک ہے کہ جن لوگوں نے جلیل کو مروایا ہے ثناء کا تعلق ان کے ساتھ نہ ہو اگر ایسی بات ہے تو وہ اسے لے گئے ہوں گے۔ اس کی واپسی کی امید مت رکھنا۔"

"داوا ابو! اگر ان لوگوں نے جلیل کو مروانا ہی تھا تو اپنی امانت اتنے برسوں اس کے پاس کیوں چھوڑی۔ اگر آپ کو یاد ہو تو جلیل پہلے پہل اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں بھی ملوث تھا۔ اس کے اوپر ایک آدھ کیس بھی بنا تھا جو اس کی اسٹرونگ بیک کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ جلیل نے ثناء کو اغوا کیا ہو اور مطلوبہ تاوان حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد اسے پاس ہی رکھ لیا ہو۔"

"نہیں میں اس دلیل کو نہیں مانتا۔ اغواء برائے تاوان کے مجرم ناکامی کے بعد مغوی کو اکثر صورتوں میں ہلاک کر دیتے ہیں تا کہ ان کے جرم کا ثبوت ختم ہو جائے۔ جلیل اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ زندہ جیتا جاگتا ثبوت ساتھ لے کر گھومتا پھرے۔ ہو سکتا ہے کہ ثناء اس کے کسی رشتہ دار کی بچی ہو۔"

"میں نے جلیل کی فائل کا گہرا مطالعہ کیا ہے بلکہ اس پر ذاتی کام کیا ہے۔ وہ چودہ سال کی عمر میں یتیم خانے سے بھاگ نکلا تھا۔ یتیم خانے کے ریکارڈ میں اس کے باپ کا نام نہیں ہے بلکہ اس شخص کا نام ہے جو اسے یتیم خانے میں لایا تھا یوں اس کے کسی رشتے دار کی موجودگی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر اس کے والدین یا رشتے دار ہوتے تو وہ یتیم خانے میں کیوں ہوتا؟ مجھے یقین ہے کہ ثناء مغوی لڑکی ہے۔"

"اگر مغوی لڑکی ہے تو اتنے برس اس نے اسے زندہ کیوں رکھا؟"

داوا ابو آپ مجرم آدمی کی نفسیات سے واقف نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے کوئی اہم کام لینا چاہتا ہو شاید میرے ساتھ ثناء کی شادی بھی کسی پلان کا حصہ ہو۔ آپ نے نوٹ کیا کہ وہ کتنی سہمی سہمی اور چپ چپ رہتی تھی جبکہ یہ محترمہ زندگی کے ایک ایک پل سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔" اس نے دروازے کے پاس کھڑی موی کی طرف اشارہ کیا ایک ایسا اشارہ جس میں بے پناہ نفرت اور تحقیر تھی۔

اپنے باپ کے بارے میں اس نے ان چالیس دنوں میں اتنے انکشافات سنے تھے کہ اس کی روح تک بے جان ہو گئی تھی۔ اب تو کوئی بات بھی اسے نئی نہیں لگتی تھی۔ شیر افگن کی زبانی وہ تمام ہسٹری سے واقف ہو گئی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق ثناء ایک مظلوم لڑکی تھی کیا واقعی ثناء مظلوم لڑکی تھی اسے تو اس گھر میں ہر آسائش حاصل تھی۔ راحت اور فواد کا رویہ تو اس کے ساتھ بے پناہ اچھا تھا۔ موی کو تو اکثر ڈانٹ پڑتی تھی مگر ثناء کو کبھی کسی نے ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ راحت ہمیشہ اسے ایک سمجھدار بیٹی قرار دیتی تھیں جیب خرچ بھی اس کا زیادہ تھا۔ موی کے مقابلے میں اسے کچھ اضافی مراعات بھی حاصل تھیں۔ فواد یا جلیل جب بھی فون کرتے پہلے ثناء کا پوچھتے اس کی پسند کو اولیت دیتے۔ پھر یہ لوگ کیوں کہتے ہیں کہ وہ اس کی بہن نہیں ہے۔ اس نے تو چھوٹی سی عمر سے ہی اسے اپنے ساتھ دیکھا تھا ہاں وہ کبھی کبھار کچھ دنوں کے لیے گھر سے غائب ہو جاتی تھی۔ راحت کہتیں کہ وہ بیمار ہے ہاسپٹل میں ہے ٹھیک ہو کر آ جائے گی اور واقعی پھر وہ آ جاتی ٹھیک ہو کر۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی ثناء کم کم ہی غائب ہوتی ایک یا دو دن کے لیے۔ اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پھر پپا بھی غائب ہونے لگے تھے۔ وہ ان کے ساتھ بہت کم رہتے تھے کہتے تھے کہ میں بزنس کی وجہ سے دوسرے شہروں میں آتا جاتا ہوں۔

"بہرحال شیر افگن ثناء تو نہیں ہے تمہیں موی سے شادی کرنی پڑے گی۔ جو ہوا بھول جاؤ اب تو جلیل اس دنیا میں نہیں ہے۔ تمہیں جتنی

آجانا چاہئے۔'' سنگین خان نے نرمی سے سمجھایا۔

''میں شاہ کی گمشدگی کا مسئلہ حل کر کے رہوں گا اسے ضرور علم ہوگا کہ وہ کہاں ہے؟'' اس نے موی کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھا۔

''بیٹا! اگر تمہیں شاہ کے بارے میں علم ہو تو بتا دو۔'' درِ شہ التجائیہ انداز میں بولیں۔ موی خاموش رہی، اسے پتہ ہوتا تو بتاتی۔

☆☆☆

''سمیر آخر شاہ کہاں جا سکتی ہے جب مجھے جلیل کے قتل کی اطلاع ملی تو اس وقت وہ گھر پر ہی تھی۔ جب اس کی ڈیڈ باڈی گھر آئی تو وہ غائب تھی اس وقت میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ تیسرے روز مجھے خدشہ ہوا کہ شاید ان ماں بیٹی نے اسے کہیں چھپا دیا ہو۔'' شیر افگن نے پھر اس مسئلے کو چھیڑا تھا۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہو۔'' سمیر نے نیا نقطہ اٹھایا۔

''اس وقت ان کا تمام گھر ایک کرائسس سے گزر رہا تھا جس کو وہ باپ کہتی تھی میں اسے گرفتار کرنے ان کے گھر میں تھا ایسے میں وہ کہاں جا سکتی ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ جلیل کے سیکرٹ سے واقف ہوگی اسی لیے اسے غائب کر دیا گیا ہے شاید ان ماں بیٹی کا ہی یہ کارنامہ ہو۔'' وہ پرسوچ انداز میں بولا۔

''نہیں مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ میں بھی تمہارے حوالے سے آنٹی اور مومنہ سے ملا ہوں وہ ایسی نہیں ہو سکتیں اور مومنہ تو بہت معصوم ہے۔''

''ہونہہ! معصوم، اسے معصوم مت کہو۔ یہ جو جرائم پیشہ لوگ ہوتے ہیں ناں ان کے کنبے میں بھی برائی کے جراثیم ضرور ہوتے ہیں۔ اگر وہ معصوم ہوتی ناں تو پولیس کو گمنام کال نہ کرتی نہ ایف آئی آر کٹوانے آتی۔''

''شیر! یہ اصول غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مولوی کے گھر مولوی ہی پیدا ہوتا نیک ماں باپ کا بیٹا بھی نیک پیدا ہوتا۔ مجرموں کے گھر مجرم پیدا ہوتے۔ نوح کے گھر کنعان اور فرعون کے محل میں موسیٰ پرورش نہ پاتا۔ میں ایسے بہت سارے لوگوں سے واقف ہوں جو خود تو بہت نیک و شریف تھے مگر اولاد گمراہی میں ڈوب گئی یا والدین غلط راہوں کے مسافر تھے مگر اولاد نے اپنی نیکی، سچائی اور کردار کی پختگی سے اپنے آپ کو منوایا۔ میں نہیں مانتا، اگر جلیل قاتل تھا، ڈاکو تھا تو اس کی بیوی اور بیٹی بھی ایسی ہی ہوں گی۔''

''سمیر نہ مانو مگر کچھ کیسز میں ایسا ہوتا ہے۔ وہ بشیر علوی یاد ہے جسے اکتوبر میں پھانسی ہو گئی ہے اس کے چاروں بیٹے اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے باپ کی گدی سنبھالے بیٹھے ہیں۔'' اس نے مشہور سمگلر اور قاتل کا حوالہ دیا۔ ''مجھے سو فیصد یقین ہے کہ مومنہ اس بارے میں ضرور جانتی ہو گی۔'' وہ مزید گویا ہوا۔

''شیر! ہم نے ان آدمیوں کے بارے میں زیادہ غور نہیں کیا ہے جو جلیل کے ساتھ اس واردات میں شریک تھے۔''

''وہ سب وعدہ معاف گواہ بن گئے تھے، سوائے زبیر کے۔''

''مجھے کسی پر بھی شک نہیں ہے۔ یہ تو سامنے کی بات ہے کہ قاتل تو جلیل ہی تھا جو کیفر کردار تک پہنچ گیا ہے مجھے کسی اور سے غرض نہیں ہے۔'' وہ دوٹوک بولا۔

''یہ بھی تو سوچو کہ قتل کے بعد زبیر کسی کو بھی نظر نہیں آیا۔''

''مر کھپ گیا ہوگا کہیں۔'' وہ بے زاری سے بولا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ شاہ زبیر کی بیٹی ہے تو پھر......''

''سوری! میں اس مفروضے پر یقین نہیں کرتا۔ اگر کروں بھی تو کیسے؟''

سمیر لاجواب ہو گیا اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''ویسے پتہ ہے۔ مما کہہ رہی ہیں کہ موی سے شادی کر لو۔'' وہ پیپر ویٹ گھماتے ہوئے سرسری لہجے میں بولا تو سمیر چوکنا ہو گیا۔

''پھر کیا سوچا ہے تم نے؟'' اس نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس کے لہجے سے اضطراب نہ جھلکنے پائے۔

''سمیر باپ تو مر گیا ہے مگر اپنی جیتی جاگتی نشانی چھوڑ گیا ہے۔ وہی آنکھیں اور پیشانی ہے، جی چاہتا ہے گرم گرم سلاخوں سے اس کا پورا وجود ہی داغ دوں مگر یہ تو بہت آسان سزا ہو گی۔ سوچ رہا ہوں کہ مما کی بات مان ہی لوں، میرے گھر کے علاوہ اس کے لیے کہیں کوئی ٹھکانہ جو نہیں ہے۔'' اس کا سنگدلی کی انتہا کو چھوتا لہجہ سمیر کے بدن میں سرد سی لہر دوڑا گیا۔

''یہ کہاں کا انصاف ہے کہ باپ کا بدلہ بیٹی سے لیا جائے۔ ویسے بھی میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا۔'' سمیر نے اسے ملامت سے دیکھا جس کا شیر افگن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''تم جیسا بھی مجھے سمجھو اس سے کوئی غرض نہیں مجھے، میں تو بس اپنے انداز میں چلنے کا عادی ہوں۔''

''ہاں اس کے لیے بے شک تم اسفل السافلین کے درجے تک گر جاؤ۔'' سمیر نہ جانے کیوں اتنا سخت جملہ بول گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شیر افگن کا ری ایکشن بھی سخت ہو گا مگر وہ مسکراتا رہا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ جو ٹھانے ہوئے ہے، کر کے رہے گا۔ اسے کوئی روک نہیں سکے گا۔ اسے تاسف سا ہوا، موی کتنی معصوم تھی اس نے جب اسے پہلی بار سڑک کے کنارے ہنستے دیکھا تھا تو اس لڑکی کی مسکراہٹ کے دائمی ہونے کی دعا کی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دوبارہ پھر اسے کبھی دیکھ سکے گا۔ بالکل غیر متوقع حالات میں سمیر نے اسے تھانے میں دیکھا پھر پلوشہ کی شادی میں یہ جان کر اسے خوشی ہوئی تھی کہ اس کی بہن شیر افگن کی دلہن بنے گی۔ اس نے بھی بہت کچھ سوچ لیا تھا کہ گھر والوں سے بات کرے گا۔ اب لگ رہا تھا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ اسے دیر ہو گئی تھی۔ موی اس کے جذبوں سے بے خبر تھی، اس نے تو غور سے سمیر کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

''شیر! وہ لڑکی واقعی معصوم ہے پھر ماں باپ سے دائمی جدائی کا صدمہ سہنے کی پوزیشن سے گزر رہی ہے۔ کوئی ایسی حرکت مت کرنا جو بعد میں پچھتاوا بن جائے۔''

''تم کیوں اس کی اتنی سائیڈ لے رہے ہو۔'' وہ خاموش ہوا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم اسے پسند نہیں کرتے، پھر شادی کا فائدہ؟''

''فائدہ تو آہستہ آہستہ ہی سامنے آئے گا۔'' وہ مسکرایا۔

''اچھا! کیا واقعی شناء تمہیں پسند تھی؟''

''اس کا جواب وقت آنے پر دوں گا۔'' اس نے کرسی کی بیک سے سر ٹکا کر ٹانگیں پھیلا لیں۔

''شیر! شناء کی گمشدگی اتنا اہم معاملہ نہیں ہے، پولیس والوں کے بارے میں مشہور ہے کہ پتا بھی کھڑک جائے تو وہ توجیہہ تلاش کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا ہے مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جلیل کے قتل اور شناء کی گمشدگی کے مابین کوئی نہ کوئی ربط ضرور ہے۔ ٹھیک ہے اگر تمہیں شناء پسند ہے تو میں ڈھونڈنے میں تمہاری پوری پوری مدد کروں گا تم موی کا باب بند کر دو۔'' شیر افگن ایک دم ٹانگیں سمیٹ کر سیدھا ہو گیا۔

''سمیر! تم دوست ہی رہو آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔ مجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ مومنہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔'' سمیر اس انکشاف پر اچھل پڑا۔ شیر افگن کے لہجے کی تلخی بھی فراموش کر گیا تھا۔

''تت...... تت...... تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''ابھی تم نے خود کہا تھا کہ پتہ بھی کھڑکے تو پولیس والے چونک جاتے ہیں اس کی حرکتیں اور توجہ ایسی تھی کہ میں خاموشی سے آبزرو کرتا رہا، بے وقوف لڑکی......'' آخر میں وہ تلخی سے بولا۔

سمیر کیپ سر پر رکھتا باہر آ گیا۔

''واقعی موی تم بہت بے وقوف لڑکی ہو۔'' گاڑی ڈرائیو کرتا سمیر بہت آزردہ ہو رہا تھا۔ ''تمہیں معلوم تک نہ ہو سکے گا کہ کسی نے تمہیں دیکھتے ہی دل میں بسا لیا تھا۔ تمہارے سنگ زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ تمہاری معصوم سی سرکشی نے کسی کو بری طرح جکڑ لیا تھا۔ تمہیں کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا۔'' سمیر نے پوری قوت سے نچلا لب دانتوں میں دبایا تھا۔

دل کی لگی کچھ اور بھی دل کو دیوانہ کرے

☆☆☆

سنگین خان رات کو ٹھیک ٹھاک سوئے تھے۔ صبح معمول کے مطابق ملازم انہیں ناشتے کے لیے بلانے گیا تو وہ بیدار نہیں ہوئے۔ فجر کی نماز سے پہلے وہ تہجد کی نماز پڑھتے تھے پھر قرآن شریف اور نماز فجر پڑھ کر وہ سو جاتے تھے۔ آٹھ بجے ناشتے کے لیے انہیں اٹھایا جاتا تھا۔ رحیم بخش کو اس حقیقت کا ادراک ہو گیا کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ اس نے روتے ہوئے ان کی کھلی ہوئی بے نور آنکھیں بند کیں اور گھر والوں کو اس اندوہناک سانحے کی اطلاع دینے کی ہمت کرنے لگا۔

درو شے تو ڈھے ہی گئیں۔ شیر دل کی شہادت کے بعد وہ ان کے لیے سایہ دار گھنا درخت بن گئے تھے۔ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کے پاس چلے آئے حالانکہ ان کی بیٹیاں کتنا شکوہ کرتیں کہ کبھی ایک ایک ہفتہ ہمارے پاس بھی آ کر رہیں، وہ مسکرا کر کہتے کہ میری بہو اکیلی ہو جائے گی۔ آج اسی اکیلی عورت کو وہ چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

پھر جس دن ان کا جنازہ اٹھایا گیا وہ پہر کو اچانک درو شے کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک لو ہو گیا۔ وہ بالکل بے ہوش ہو گئی تھیں۔ پلوشہ نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا، شیر افگن خود انہیں ہاسپٹل لے جانے کے انتظام کر رہا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی وہ طبی امداد سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔ پلوشہ روتے روتے بیہوش ہو گئی۔ ارباز کو بہت فکر تھی کیونکہ اس کے وجود میں نئی زندگی پل رہی تھی۔ شیر افگن نے بے پناہ حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا۔ کہیں بھی کم ہمتی نہیں دکھائی تھی۔ وہ جانتا تھا اس کی بزدلی سے بہن بھی بکھر جائے گی۔

موئی کو یقین ہو چلا تھا کہ اب اسے یہاں سے دھکے دے کر نکالا جائے گا۔ آنٹی کی وفات کو تقریباً ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا۔ وہ بالکل تیار تھی مگر شیر افگن یا پلوشہ کی طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی بلکہ رات کو پلوشہ ارباز کے ساتھ چلی آئی۔ ساتھ اس کی ساس بھی تھیں وہ سب شیر افگن سے ملنے آئے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی وہ بھی ان کے آنے کے پندرہ منٹ بعد لوٹ آیا، شاید اسے ان کے آنے کی خبر تھی جو وہ آ گیا تھا۔ وہ ایسے ہی ڈرائنگ روم کے آگے سے گزرتے گزرتے رک گئی تھی۔ زور زور سے باتیں ہو رہی تھیں، آواز باہر تک آ رہی تھی۔

''اس کھڑاک کی ضرورت ہی کیا ہے، بس دو دن خالائیں اور قریبی گھروں سے ایک ایک فرد کو بلایا جائے، میں ہنگامہ کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' شیر افگن کی اکھڑی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''یوں کہو ناں تم کسی کو بلانا نہیں چاہتے۔'' پلوشہ کی ساس کی ناراض سی آواز ابھری۔

''ہاں افگن اگر رشتے داروں کو نہ بلایا تو ناراضگی ہو جائے گی۔'' ارباز بولا۔

''شادی میری ہو رہی ہے یا رشتے داروں کی۔'' شیر افگن ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

''ہائیں اس کی شادی کس سے ہو رہی ہے۔'' موئی حیران ہوئی۔

''اور ہاں پلوشہ! جیولری اور کپڑے خریدنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یہ ڈھکوسلے پسند نہیں ہیں۔'' وہ قطعی انداز میں بولتا جھٹکے سے دروازہ کھول کر نکلا۔ موئی دیوار سے چپک گئی۔ شکر تھا کہ وہ آگے چلا گیا تھا ورنہ اسے یہاں چوروں کی طرح کھڑے دیکھ کر کچھ نہ کچھ ضرور کہتا۔ یہ راز بھی کھل گیا کہ اس کی شادی کسی اور سے نہیں بلکہ اسی سے ہو رہی ہے۔ پلوشہ کھڑے کھڑے یہ اطلاع دے کر پلٹ گئی تھی، یہ کہتے ہوئے کہ ''ہمیں مما

کی آخری خواہش کو ہر صورت پورا تو کرنا ہی ہے۔"

موی نے اپنا دل ٹٹولا، وہاں خوف کالے ناگ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا جی چاہا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے کہیں نہ کہیں ٹھکانہ مل ہی جائے گا۔ آخر دارالامان کس لیے ہیں وہ اس سے اتنی نفرت جو کرتا ہے پھر شادی کیوں کر رہا ہے۔ وہ تو شاہ کو ڈھونڈنے کی بات کر رہا تھا۔ موی تو ایک طرح سے اس پر صبر کر ہی چکی تھی۔ آج اپنے اندر جھانکا تو احساس ہوا کہ وہ صبر نہیں جبر تھا۔ معلوم ہونے پر کہ آنٹی شاہ کے لیے شیر افگن کا پروپوزل لائی ہیں وہ کمرہ بند کر کے گھٹ گھٹ کر کتنی روئی تھی۔ اسے کتنا دکھ ہوا تھا پھر ایک دم سارے منظر ہی بدل گئے۔ اس کے پپا کا قتل، امی کی موت، شاہ کا جانا سب کتنے دلخراش سے حادثے تھے اور جب مالک مکان نے فوراً اسے مکان چھوڑنے کا نوٹس دیا تو اسے یوں لگا تھا کہ زندگی ختم ہوگئی ہے۔ آنٹی درو شے نہ جانے کس بہادری سے اسے شیر دل ہاؤس لائی تھیں اور اسے اپنی بہو بنانے کی بات کی تھی۔ پلوشہ اور شیر افگن کی مخالفت پہ اسے اپنا آپ بہت کمتر لگا تھا پھر وہ کیسے مان گیا یہ بھی ایک راز تھا۔ اس نے خود کو حالات کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔

پلوشہ، ارباز صبح پھر چلے آئے۔ چند منٹ کے وقفے سے شیر افگن کے تین چار اور رشتے دار آئے۔ موی خود کو کسی ڈرامے کا کردار محسوس کر رہی تھی جس کے ہاتھ میں ابھی سکرپٹ اور مکالمے نہیں تھمائے گئے تھے۔ شیر افگن تین بجے کے قریب لوٹا ساتھ کیبر بھی تھا۔ مومنہ سوئی ہوئی تھی جب پلوشہ استری شدہ سوٹ لیے اس کے کمرے میں آئی۔

"موی اٹھو شاور لے کر یہ کپڑے پہن لو ایک آدھ گھنٹے میں مولوی صاحب آنے والے ہیں۔" پلوشہ نے اسے زور زور سے ہلایا۔ وہ آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی۔ پلوشہ کی بات سوئے سوئے ذہن کے ساتھ اسے سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"نکاح ہے تمہارا شام کو شیر افگن بھائی کے ساتھ۔" پلوشہ نے زور سے بتایا۔ یہ سب غیر متوقع تو نہیں تھا پھر بھی وہ پوری جان سے لرز گئی اور پلوشہ کے لائے ہوئے سوٹ کی طرف دیکھا۔ انگوری کلر کا کاٹن کا پرنٹڈ سوٹ تھا۔ دوپٹے پر کیش لگی ہوئی تھی۔ شیر افگن کی ہدایت پر پلوشہ بے تکلف لگا یہ سوٹ لائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ سمپل اور ڈل سا کلر ہو پر وہ اپنے نفیس ذوق کے ہاتھوں مجبور تھی۔ خاصے مہنگے بوتیک سے یہ سوٹ لیا تھا۔ تراش خراش بھی بے حد عمدہ تھی۔ اس نے کہا کہ میں اپنی جیولری مومنہ کو پہنا دوں جوابا شیر افگن نے اسے بری طرح جھاڑا تھا۔

"مما کا انتقال ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے جو ہم خوشیاں منائیں۔ ہر کام سادگی سے ہوگا، شرع میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ سرخ جوڑے اور منوں زیوروں کی غیر موجودگی کے باعث نکاح ہی نہیں ہوتا۔" وہ چپ ہوگئی تھی البتہ اس کی ساس بہت غصے میں تھیں۔

"تمہارے افسران، کولیگ اور دوست کیا کہیں گے، کم از کم انہیں تو انوائٹ کرلو۔" انہوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر مشورہ دے ڈالا۔

"یہ میرا درد سر ہے۔ اگر انہوں نے کچھ کہا تو بڑا مناسب جواب ہے میرے پاس۔" اس نے اہمیت ہی نہیں دی پھر انہوں نے بھی نہ بولنے کی قسم کھالی۔

موی نہا کر پلوشہ کے لائے کپڑے پہن کر نکلی اور بال خشک کر کے سادہ سی چوٹی گوندھ لی۔ شیر افگن کی خالہ نے اسی وقت اپنی نند کو ساتھ لیا اور بازار سے چوڑیاں، مہندی اور میک اپ کے لوازمات خرید لائیں۔ موی کے نہ نہ کرنے کے باوجود انہوں نے اس کا ہلکا ہلکا میک اپ کیا،

چوڑیاں پہنائیں اور مہندی سے گل بوٹے بنائے۔ دلہن کے بجائے وہ فنکشن میں جانے والی ایک سادہ سی لڑکی لگ رہی تھی جس نے زندگی میں پہلی بار میک اپ کیا ہو۔ انہوں نے اپنی سونے کی رنگ اور لاکٹ اتار کر اسے پہنانا چاہا تو اس نے شدت سے انکار کر دیا۔ شیر افگن کی خالہ کو اس پر بہت ترس آیا موی کے کانوں میں سونے کی ننھی منی بالیاں تھیں جو میٹرک کرنے پر راحت نے اسے گفٹ کی تھیں۔ وہ ہمیشہ ان کو پہنے رہتی تھی۔ سونے کے نام پر اس کے کانوں میں یہی زیور تھا یا پھر کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں جو وہ بازار سے ابھی ابھی لائی تھیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ شیر افگن انتقاماً یہ ڈھونگ رچا رہا ہے۔ دستک پہ موی سنبھل کر بیٹھ گئی۔ باریش آدمی رجسٹر اٹھائے اندر آ رہا تھا۔ شدت ضبط سے اس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں مگر وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ اپنی کمزوری اور خوف کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی، اس نے بڑے حوصلے سے سائن کیے۔

ڈرائنگ روم میں سمیر شیر افگن کو مبارکباد دے رہا تھا۔ سمیر واحد دوست تھا جسے اس نے شادی میں شرکت کا اعزاز بخشا تھا وہ مومنہ کے تاثرات دیکھنا چاہتا تھا مگر آثار بتا رہے تھے کہ اسے ڈرائنگ روم میں نہیں لایا جائے گا۔ وہ گفٹ دینے کا بہانہ کر کے موی کے کمرے میں آ گیا جو کشن پر بیٹھی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنے عام سے حلیے میں نظر آئے گی کیونکہ اس نے عورتوں کے باہر نکلتے ہی منہ دھو لیا تھا اور چوڑیاں اتار کر پھینک دی تھیں جن کے ٹکڑے اس کے آس پاس بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اسے تنہا کسی مزار پر بیٹھی نامرادی کے دکھ سے تھکی لڑکی لگی۔ سمیر نے گفٹ پیک نیک خواہشات کے دعا دیتے اس کی طرف بڑھایا جو اس نے میکانکی انداز میں لے کر رکھ لیا۔

''مومنہ! آپ کی فیلنگز کو میں سمجھ رہا ہوں۔'' اس نے بات کا آغاز کیا تو موی نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ بھلا وہ اس کے احساسات کو کیسے سمجھ سکتا تھا، کیا وہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ کس عظیم دکھ سے گزر رہی ہے، وہ رونا چاہتی تھی مگر رو نہیں پا رہی تھی۔

''آپ بہت کم عمر ہیں اور دنیا بہت چالاک۔ لوگ چہروں پر نقاب لگائے پھر رہے ہیں آپ کو انسانوں کی پہچان ہی نہیں ہے، پرکھ ہی نہیں ہے۔ اتنی عجلت میں یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' وہ ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے یوں سن رہی جیسے اس کے بجائے وہ دیواروں سے مخاطب ہے۔

گنے چنے مہمان ڈنر کے بعد چلے گئے۔ صرف سمیر رہ گیا تھا۔ وہ نوٹ کر رہا تھا کہ شیر افگن معمول سے ہٹ کر بہت خوش لگ رہا ہے، مومنہ کے برعکس وہ نک سک سے تیار ہوا تھا اور ہمیشہ کی طرح شاندار اور فریش لگ رہا تھا۔ قیمتی مردانہ پرفیوم کی خوشبو اس کے باذوق ہونے کی دلیل تھی جو اس نے لگائی ہوئی تھی۔ مومنہ کی خیریت کی دعائیں کرتا وہ وہ بھی اٹھ آیا۔

مومنہ کو ذرہ بھر خوش فہمی نہیں تھی پھر بھی دروازہ پر ہوتی دستک سن کر وہ چونک گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ دروازے کو لاک لگا کر بستر پر دراز ہوئی تھی۔ وہ اٹھی اور جوتے پہنے بغیر دروازہ کھولا، دوپٹہ مسہری پر پڑا ہوا تھا جو اس کی ازلی لاپروائی کی دلیل تھی۔

''فوراً میرے کمرے میں آؤ۔'' وہ حکم دے کر پلٹ گیا۔ اس نے دوپٹہ کندھوں پر ڈالا۔ نہ جانے اس میں کہاں سے بہادری آ گئی تھی کہ وہ تیز تیز چلتی ایک بھی سیکنڈ ضائع کیے بغیر اس کے کمرے میں گھسی۔ شیر افگن واش روم میں تھا۔ وہ بیڈ سے خاصے فاصلے پر پڑی کرسی پر بیٹھ گئی اندر سے فی الحال اس نے خود کو مضبوط کیا ہوا تھا۔ شیر افگن پندرہ بیس منٹ بعد کپڑے تبدیل کر کے نکلا اسے دیکھتے ہی موی نے نگاہوں کا رخ موڑ لیا وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے ٹھہرا اور ہیئر برش بالوں میں پھیرا پھر پلٹا اس کے جھکے سر کو گھورتا رہا۔ اسے یوں لگا کہ اگر اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو بھسم ہو

جائے گی۔ ہاتھوں کو باہم پیوست کیے وہ بااعتماد نظر آنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ شیر افگن نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلیاں مہندی سے سجی ہوئی ہیں اس کی آنکھوں میں کچھ دیر قبل طاری ہونے والی شدید نیند گویا ٹھہر گئی تھی۔

"مجھ سے محبت کرتی ہو؟" عجیب سوال اور شخص تھا بجائے اسے محبتوں کا یقین دلانے کے پوچھ رہا تھا مجھ سے محبت کرتی ہو۔ وہ جیسے اپنے یقین پر مہر ثبت کرنا چاہتا تھا، وہ کچھ نہیں بولی۔

"مجھے بس ہاں یا نہ میں جواب چاہیے۔" وہ اب کے سخت لہجے میں بولا، موی آہستہ سے پیچھے ہوئی وہ اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا لپک کر اس کے گداز ہاتھ تھام کر اسے جانے سے روکا جن کی حرارت اور نرماہٹ شیر افگن کے لیے کم از کم نئی ہی تھی۔

"شاباش مومنہ امت شرماؤ مجھے جواب دو۔" نہ جانے کیوں وہ اتنے نرم لہجے میں بول رہا تھا۔

موی کی خاموشی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی وہ جیسے چپ کا روزہ رکھے ہوئی تھی، کچھ بول کر نہیں دے رہی تھی۔

"مومنہ میں آخری بار پوچھ رہا ہوں تمہیں مجھ سے محبت ہے یا نہیں؟" شیر افگن کی گرفت غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھوں پر سخت ہو گئی تھی۔

"نہیں نہیں نہیں، قیامت تک نہیں۔" مومنہ کا جواب انتہائی غیر متوقع تھا۔ ساتھ ہی شیر افگن کا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا تھا۔

"جھوٹ بولتی ہو۔" وہ دانت پیستے ہوئے غرایا۔

موی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ایک ایک اشک اس کی جھوٹی محبت کا گواہ تھا۔

☆☆☆

"ہیلو پلوشہ، مومنہ گھر سے غائب ہے۔" شیر افگن نے ایک جملہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

"ہیلو ہیلو۔" پلوشہ نے کریڈل دبایا دوسری طرف سے آتی ٹوں ٹوں کی آواز سن کر اسے احساس ہوا کہ وہ خوامخواہ ایسے کر رہی ہے اس نے ریسیور رکھا اور اٹھ کر گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ چار گھنٹیاں بجنے پر بھی کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ وہ ریسیور رکھ کر ارباز کو جگانے لگی۔ وہ ساڑھے نو بجے ہاسپٹل جاتا تھا۔ اتنی جلدی بیدار کیے جانے پر جھنجھلایا کیونکہ ابھی ساڑھے سات ہی بجے تھے اور پلوشہ صور اسرافیل پھونکنے پر تلی ہوئی تھی۔

"ارباز، مومنہ گھر سے غائب ہے۔"

"کیا؟" وہ بستر پر لیٹے لیٹے اچھلا۔

"ابھی ابھی بھائی جان کو فون آیا کہ مومنہ غائب ہے۔ اتنا کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔" ارباز نے بستر چھوڑ دیا ماں کو بتا کر اس نے گاڑی نکالی۔ وہ خود حیران تھیں کل اسے اچھا بھلا چھوڑ کر آئی تھیں راتوں رات وہ کہاں غائب ہو گئی۔ ارباز کو روک کر وہ بھی بیٹھ گئیں۔ پلوشہ آنے والے وقت کے تصور سے سہم گئی تھی کل ہی تو بھائی کی شادی ہوئی تھی اس بات کو چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے اور یہ ہو گیا تھا۔ اسے جلدی سے سب کچھ جان لینے کی جستجو تھی۔ شیر افگن ڈائننگ ٹیبل پر اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ پلوشہ کے خیال میں اسے بہت پریشان لگنا چاہیے تھا مگر اس کے خاص آثار نظر

نہیں آ رہے تھے۔

''بھائی جان یہ کیسے ہوا؟'' اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔

''رات کو اپنے بیڈ روم میں اچھی خاصی سوئی ہوئی تھی۔ میں نے باقاعدہ دستک دے کر چیک کیا تھا، رو رہی تھی کہ پپا اور امی یاد آ رہے ہیں، میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے بیڈ روم میں آ کر سو گیا۔'' شیر افگن نے نہ جانے لگا ہیں کیوں چرائیں...... ''صبح ناشتے کے لیے ملازم اٹھانے گیا تو وہ نہیں تھی۔ میں نے پورے گھر میں تلاش کیا اور پھر تمہیں فون کر دیا۔'' اس نے مزید بتایا۔

''بھاگ گئی ہوگی۔ خون کا اثر ہو کر رہتا ہے۔'' بلوشہ زہر خند ہو کر بولی۔ شیر افگن کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تھا۔

''بیٹا اس کی دوستوں کو فون کرو شاید وہاں چلی گئی ہو۔'' بلوشہ کی ساس بولیں۔

''مجھے اس کی دوستوں کی خبر نہیں ہے نہ کسی کا فون نمبر میرے پاس ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا تو بلوشہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

''ہاں بھلا ہمیں کیا علم تھا کہ وہ ایسی حرکت کرے گی ورنہ اس کی دوستوں کے ایڈریس بھی نوٹ کر لیتے۔'' سب سے زیادہ حیرت سمیر کو ہوئی تھی۔ بلوشہ کو خاص دکھ نہیں ہوا تھا وہ بھائی کی دور اندیشی کی قائل ہو گئی تھی۔ اچھا ہوا جو انہوں نے شادی پر کسی کو نہیں بلایا۔

''شیرا مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ مومنہ کہیں جا سکتی ہے۔ وہ بھی شادی شدہ زندگی کے محض چند گھنٹے گزار کر۔'' سمیر سے یہ خبر ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''وہ جا چکی ہے تم مان لو۔''

''تو بابا اسے تلاش کرو تمہاری بے حسی دیکھ کر مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم اس کے شوہر ہو۔'' سمیر نے اس کے لتے لیے۔

''کیا کروں گا تلاش کر کے۔ اب وہ پہلے والے حال میں تو ہوگی نہیں، دوسرے یہ کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔''

''تو تم کہاں تھے؟''

''اپنے بیڈ روم میں۔''

''پھر تمہیں، یعنی ایک ذہین آفیسر کو وہ غچہ دے کر کیسے نکل گئی؟''

''سمیر وہ رو رہی تھی۔ میں اسے چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ کر سو گیا تھا۔ اس کی نگرانی تو نہیں کر رہا تھا جو مجھے اس کے بولڈ اسٹیپ کی خبر ہو جاتی۔'' اس نے سمیر کا شک رفع کیا۔

''شاید اسے یہ فیصلہ منظور نہیں تھا۔''

''اگر اسے یہ فیصلہ منظور نہ ہوتا تو وہ کل بھی یہ قدم اٹھا سکتی تھی۔ اس کے ساتھ کسی رشتے کسی زنجیر کا بوجھ تو نہ ہوتا۔ کیا نکاح کے بعد ہی اس نے یہ سب کرنا تھا۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے کل موقع ہی نہ ملا ہو۔ ویسے میں خود بھی پریشان ہوں وہ کہاں جا سکتی ہے پہلے شاہ اور اب یہ مومنہ، میں اپنی

طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے عہد کیا پھر اس ایک ہفتے میں اس نے اپنے ممکنہ دستیاب وسائل سے موی کا پتہ لگانے کی کوشش کی جس کا خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اسے نہ ملنا تھا نہ ملی۔ اتنے بڑے انسانوں کے جنگل میں وہ جانے کہاں چھپ گئی تھی جو شیر افگن جیسا ذہین آفیسر بھی اسے ڈھونڈنے میں ناکام ہو گیا تھا۔

☆☆☆

عبدالرشید عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے گھر کی طرف ہو لئے۔ روزانہ کی طرح وہ جونہی روڈ کراس کر کے پرے میدان کی طرف بڑھے تو ہلکے ہلکے رونے کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ آواز فاصلے سے آرہی تھی وہ سمت کا تعین کر کے معاملہ جاننے کے لیے آگے ہوئے۔ ڈیڑھ دو ماہ کا بچہ گھاس کے فرش پر کمبل میں لپٹا بے یار و مددگار پڑا رو رہا تھا جانے کتنی دیر سے وہ یہاں پڑا ہوا تھا" لگ رہا تھا کہ وہ روتے روتے تھک گیا ہے تبھی اب اس کی گھٹی گھٹی آواز نکل رہی تھی۔ عبدالرشید پوتے پوتیوں والے تھے بچے کو یونہی پڑے دیکھ کر ازلی محبت نے جوش مارا نہ جانے کون شقی القلب تھا جو اس ننھے سے پھول کو یہاں پھینک گیا تھا۔ نومبر کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ کافی سردی تھی۔ لوگ گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ پھر یہ میدان جہاں یہ بچہ پڑا ہوا تھا مغرب کے بعد سنسان ہو جاتا تھا۔ اس لیے کسی کے کان میں بچے کی آواز نہیں پڑی تھی۔ اس بے چارے کی خوش قسمتی تھی کہ عبدالرشید ادھر سے گزرے تھے۔ انہوں نے کمبل سمیت بچے کو اٹھالیا اور گھر لے آئے۔ ان کی دونوں شادی شدہ بیٹیاں بھی آئی ہوئی تھیں ساتھ داماد بھی تھے۔ انہیں بچے سمیت دیکھ کر سب حیران ہوئے۔

"ابا جی! یہ کس کا بچہ ہے؟" ان کا بڑا بیٹا کریم اشتیاق سے آگے ہوا۔ انہوں نے تمام قصہ بتا دیا۔ ان کی بیوی کے چہرے پر فکر مندی چھا گئی۔ پاکستان بنے پانچ چھ سال ہوئے تھے۔ وہ ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے اور کلیم داخل کر کے یہ گزارنے لائق گھر حاصل کیا تھا۔ محلے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ پوری گلی انہیں حاجی صاحب کے نام سے پکارتی تھی حالانکہ انہوں نے حج نہیں کیا تھا بس ان کی نیکی و شرافت کے باعث محلے والوں نے یہ اعزاز بخشا تھا۔ بختاں کو یہ بچہ حاجی صاحب کے خلاف سازش لگ رہا تھا جس کا اس نے اظہار کیا تو تمام بچوں نے تائید کی۔

"آپ محلے میں مسجد میں اعلان کروادیں اور جان چھڑائیں۔" وہ بڑی روکھی عورت تھی۔

"اماں آپ کیسی بات کرتی ہیں۔ یہ گم تو نہیں ہوا ہے بلکہ مجھے یقین ہے کسی نے اپنی جان چھڑائی ہے۔" بڑا داماد بولا تو وہ سہم گئیں۔ اتنے میں بچہ زور زور سے رونے لگا۔ شاید وہ بھوکا تھا کلثوم نے ماں کے اشارے پر اس کے لیے دودھ گرم کیا اسے اٹھانے پر گیلے پن کا احساس ہوا۔ اس نے کمبل اتارا تو ایک تہہ شدہ پرچہ نکل کر گرا جسے عبدالرشید نے فوراً اٹھالیا۔ گھر میں صرف کریم ہی چار جماعتیں پڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے وہ کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ با آواز بلند پڑھنے لگا۔

"میں غربت کے باعث اپنے بچے کی پرورش نہیں کر سکتی اس لیے اسے چھوڑ کر جا رہی ہوں جس کسی کو بھی ملے وہ اسے اپنا بچہ سمجھ کر پال لے۔
ایک دکھی ماں۔"

بس یہ چند جملے تحریر تھے۔ سب اپنی اپنی رائے دینے لگے۔

"دیکھو تو کیا غریب کا بچہ لگتا ہے کپڑے کتنے اچھے ہیں۔ یہ کوئی اور چکر ہے۔ ابا جی صبح اسے جا کر یتیم خانے چھوڑ آتے ہیں کسی سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نہ ہو ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔"

کریم کی بات وزن دار لگی تھی چنانچہ دوسرے روز عبدالرشید کریم کے ساتھ جا کر بچے کو یتیم خانے چھوڑ آئے۔ ان کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر بختاں کے آگے وہ مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے بچے کے پاس سے ملنے والا پرچہ بھی یتیم خانے کے نگران کے سپرد کر دیا تھا۔

انچارج نے بچے کی پہچان کی خاطر اس کا نام جلیل رکھا۔ وہ بھی باقی بچوں کے ساتھ پلنے لگا۔ پانچ سال ہونے پر اس کی پڑھائی لکھائی شروع ہو گئی۔ سکول یتیم خانے کی چار دیواری میں ہی تھا۔ یہیں پر ایک جھگڑالو لڑکا زبیر بھی تھا جو جلیل سے تین چار برس بڑا تھا۔ بچوں کو مارنا، پیٹنا، ان کی چیزیں چھیننا اس کا معمول تھا۔ کہیں سے اسے پتہ چل گیا تھا کہ جلیل میدان سے ملا تھا اور اسے ایک بڑے میاں چھوڑ کر گئے تھے۔ اس کے ماں باپ کا بھی کچھ پتہ نہیں تھا اس روز سے وہ اسے جلانے ستانے لگا۔ جلیل خون کے گھونٹ بھر کر رہ جاتا کیونکہ زبیر نہ صرف اس سے عمر میں بڑا ملکہ قد کاٹھ اور طاقت میں بھی بے مثال تھا۔ جلیل نے اس کی برتری ذہنی طور پر تسلیم کر لی تھی پھر آہستہ آہستہ زبیر کا رویہ بدلنے لگا۔ وہ اس سے اچھی طرح پیش آنے لگا۔ اصل میں وہ یہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اسے ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ جلیل کی فرمانبرداری کی بدولت وہ اسے پسند کرتا تھا بالآخر ایک دن وہ اپنے ساتھیوں سمیت بھاگ گیا۔ جلیل بہت خوفزدہ تھا جبکہ زبیر کو پرواہ نہیں تھی لگتا تھا کہ اس نے پہلے سے ہی ہر پہلو پر غور کر رکھا تھا۔ ایک طرح سے وہ ان کا لیڈر بن گیا تھا۔ پہلی رات تو ان کی ایک دکان کے تھڑے پر گزری دوسرے روز زبیر ایک ہٹے کٹے فقیر کے ساتھ کہیں چلا گیا۔ واپس آیا تو انہیں اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ وہ چاروں کوئی سوال کیے بغیر اس کے ساتھ ہو لیے وہ انہیں فقیروں کے ڈیرے پر لے آیا تھا۔ پھٹے پرانے بدبودار لباس پہنے ہر سائز اور ہر عمر کے فقیر یہاں موجود تھے۔ ان چاروں کو بھی وہاں جگہ مل گئی۔

عجیب وحشت بھرا غلیظ سا ماحول تھا۔ کمرے میں گنجائش سے زیادہ لوگ تھے۔ چرس اور سگریٹ کی بدبو فضا میں چکراتی پھر رہی تھی۔ جلیل کو ابکائیاں آنے لگیں۔ اس کے مزاج میں بے انتہا نفاست تھی جس کے باعث زبیر اسے شہزادہ کہتا تھا۔ بہر حال وہ مارے بندھے اسی کمرے میں سویا۔ صبح انہیں ان کی ڈیوٹی سے آگاہ کیا گیا جو کہ بھیک مانگنے کی تھی۔ جلیل کو تذبذب ہوا تو زبیر نے اسے گھما کر لات ماری۔

"ذلیل کی اولاد اپنی اہمیت دیکھ، خواہ مخواہ زیادہ شریف نہ بن۔ تیری ماں تجھے پھینک کر گئی تھی۔ ہم سے لڑنے کی کوشش نہ کر۔" زبیر نے اس کی زبان بند کر دی وہ روز بھیک مانگ کر واپس آ کر حساب دیتے۔ زبیر سردار کا پسندیدہ شاگرد بنتا جا رہا تھا کیونکہ وہ ہاتھ کی صفائی بھی دکھانے لگا تھا۔ چھوٹی موٹی چوریاں اضافی صفت تھی، جلیل بھی اس کے رنگ میں رنگ گیا۔

زبیر نے بڑی ترقی کی۔ چار سال کے بعد اپنا الگ ڈیرہ بنا لیا۔ دوسرے فقیر سردار کو چھوڑ کر اس سے آ ملے۔ زبیر نے شراب کشید کرنے کی بھٹی بھی لگا لی اور جوا کرانے لگا اب اس کی جیب میں بڑا مال تھا۔ پھر ایک لڑکی پر اس کا دل بری طرح آ گیا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کیونکہ لڑکی کے گھر والے کسی طرح بھی اس کے ساتھ اس کی شادی نہ کرتے وہ جرائم کی دنیا کا جانا پہچانا نام بن چکا تھا۔ چنانچہ اس نے صادقہ کو بھی اٹھوا لیا اور جبری نکاح کر لیا۔ ادھر جلیل کو بھی ایک لڑکی راحت اچھی لگنے لگی۔ سفید اجلا لباس اور کتابیں ظاہر کرتی تھیں کہ وہ طالبہ ہے۔ راحت کو بھی جلیل کی نگاہوں کا احساس

ہو گیا مگر وہ اظہار محبت کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ پچھلے روز ہی تو اس پر اغواء برائے تاوان کا کیس بنا تھا۔ سارا کام زبیر کا تھا مگر نام اس کا آ گیا تھا۔ بعد میں زبیر نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر معاملہ ختم کروا دیا مگر جلیل بہت خوفزدہ تھا۔ زبیر کی سنگ دلی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ مطلوبہ رقم نہ ملنے پر دو بچوں کو قتل بھی کر چکا تھا بہر حال اس نے جلیل کی پریشانی بھانپ لی اور کہا۔

''راحت کو اغواء کروا دوں۔ جب دل بھر جائے تو چھوڑ دینا۔'' وہ خود بھی تو یہی کرتا تھا۔ بچی پیدا ہونے کے باوجود اس کے معمولات و احساسات میں فرق نہیں آیا تھا۔ صادقہ اب ناکارہ شے بن گئی تھی۔

جلیل کو یہ مشورہ بالکل پسند نہیں آیا۔ اس نے کہا۔ ''میں شریفانہ طریقے سے راحت کو اپنانا چاہتا ہوں۔''

حیرت انگیز طور پر زبیر نے اس کی بات مان لی اور راحت کے محلے میں اسے مکان دلوا دیا۔ اب آگے کا کام جلیل کو خود ہی کرنا تھا۔ محلے میں اپنے اخلاق و شرافت کے باعث اس نے جلد ہی شہرت حاصل کر لی۔ راحت کا رشتہ مانگنے کا بہترین موقع تھا۔ صادقہ اور زبیر جلیل کے بھابی بھائی بن کر آئے۔ اپنی لمبی چوڑی جائیداد کی تفصیل بتائی۔ ان کی توقع کے عین مطابق راحت کے گھر والے متاثر ہو گئے اور یوں جلیل کی شادی راحت سے ہو گئی۔ وہ بہت خوش تھا، فطری طور پر زندگی کو گزارنا چاہتا تھا مگر زبیر اس کی کوششیں ناکام بنانے پر تلا ہوا تھا اب اس نے اسمگلنگ کے میدان میں بھی قدم جما لیے تھے۔ ایک رات وہ اس کے گھر آیا اور اپنے نئے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ بینک میں ڈاکہ ڈالنا تھا اور سونا سرحد پر اسمگل کرنا تھا۔ ''باقی زندگی عیش سے گزرے گی شہزادے بس آخری بار ہے اپنا نہیں تو بھابی اور بچی کا خیال کر لو۔'' اس نے نیا پتا پھینکا، جلیل ہار گیا۔

زبیر نے جھول سے پاک پلان بنایا تھا اور چیدہ چیدہ ساتھیوں کے سوا کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی مگر اس کے ساتھیوں میں کچھ مخالف بھی تھے جنہوں نے کسی نہ کسی طرح اس منصوبے کا پتہ چلا لیا اور مخبری کر دی۔ یہ پلان بہت بڑا اور خطرناک تھا اس لیے ڈی آئی جی بذات خود اس کیس کو ہینڈل کر رہے تھے، وہ بھی تیار تھے۔ زبیر اور اس کے ساتھی اطمینان سے اپنا کام مکمل کر کے بینک سے نکلے۔ یہ اب تک کی جانے والی سب سے بڑی بینک ڈکیتی تھی جس میں کروڑوں روپیہ اور منوں سونا لوٹ لیا گیا تھا۔ شیر دل مرزا اور ان کے سپاہی باہر موجود تھے جیسے ہی وہ لوگ باہر نکلے تیز روشنیوں میں نہا گئے۔ زبیر نے فوراً اپنے ساتھیوں کو پوزیشن لے کر فائر کرنے کا اشارہ کیا۔ دونوں طرف سے تڑاتڑ فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ جلیل کے ہاتھ میں پستول تھا مگر اس میں چلانے کی ہمت نہیں تھی۔ زبیر مسلسل چیخ رہا تھا۔ شیر دل کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ صحافیوں کو بھی معاملے کی بھنک پڑ گئی تھی وہ اپنے کیمروں سمیت موجود تھے ایک موقع پر اچانک زبیر شیر دل کی بندوق کی زد میں آ گیا۔ ''جلیل فائر'' وہ چیخا مگر جلیل کا پستول خاموش رہا اس نے لرزتے ہاتھوں سمیت اعشاریہ دو پانچ کا ریوالور اونچا کیا۔ ٹھائیں ٹھائیں دو پستولوں نے ایک ساتھ گولیاں اگلیں۔ زبیر کا نشانہ خطا نہیں گیا، شیر دل زمین پر گر پڑا تھا جلیل ابھی تک بنا سوچے سمجھے بے سمت گولیاں چلا رہا تھا۔ فلش لائٹ اس کے چہرے پر چمکی زبیر پوزیشن بدل چکا تھا اس نے بھاگتے بھاگتے جلیل کو اپنی طرف گھسیٹا اس کا ریوالور وہیں گر گیا زبیر نے تقریباً اسے اٹھا کر پک اپ میں پھینکا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''تم نے مروانے میں کسر نہیں چھوڑی تھی ذلیل! دل چاہ رہا ہے تجھے بھی شوٹ کر دوں تیری کوئی گولی کام نہیں آئی۔ اگر میں ہمت نہ کرتا تو شیر دل پکڑ لیتا ہم سب کو اور اس وقت ہم سب حوالات میں ہوتے۔'' وہ دانت پیستے ہوئے جلیل کو گھور رہا تھا پھر انہوں نے پک اپ راستے میں ہی

چھوڑ دی اور باقی رستہ پیدل طے کیا۔ زبیر کے لیے بری خبر تھی، صادقہ اچانک مرگئی تھی اس کے ساتھی نے فون کر کے اطلاع دی تھی۔

''مرگئی ہے تو میں کیا کروں؟'' اس نے زیرلب فون کرنے والے کو موٹی سی گالی دی۔

''دادا بچی رو رہی ہے۔'' زبیر فکرمند ہوگیا۔

''جلیل! ایسا کر بھابی کو لے آ۔ ہمارے لیے ویسے بھی کچھ روز خطرہ ہے۔ یہ نہ ہو کہ پولیس اس کے ذریعے ہم تک پہنچ جائے۔'' یوں جلیل راحت اور مومنہ کو لے آیا جہاں زبیر کی بیٹی شاہ گلا پھاڑ کر رو رہی تھی۔ راحت جلیل کے کاروبار سے اچھی طرح واقف ہوگئی تھی مگر یہ وقت طعنے دینے کا نہیں تھا۔ اسے بینک ڈکیتی کا بھی علم ہوگیا تھا۔ صبح کے اخبارات نے اس کا رہا سہا سکون زائل کر دیا۔ اخبارات کے مطابق ڈی آئی جی شیر دل خان اور ان کے چار سپاہی ہلاک ہوگئے تھے۔ زبیر کا صرف ایک ساتھی مارا گیا تھا۔ جلیل کی ہاتھ میں ریوالور پکڑے تصویر چھپی تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا ڈی آئی جی شیر دل خان کا قاتل، موقع واردات سے اس کا ریوالور بھی ملا تھا جس پر اس کے فنگر پرنٹ...... تھے۔

''زبیر یہ جھوٹ ہے۔ تم تو جانتے ہو یہ قتل میں نے نہیں کیا ہے۔'' جلیل متوحش ہوگیا تھا۔

''تم پولیس کو بے شک کہتے رہو کہ میں نے نہیں کیا ہے وہ نہیں مانیں گے۔ یہ تصویر تمہارے جرم کا ثبوت ہے۔'' زبیر نے صاف آنکھیں پھیر لیں۔ درحقیقت اس کا عیار ذہن نیا منصوبہ بنا رہا تھا۔ ڈی آئی جی کا قتل کوئی عام واقعہ نہیں تھا ملک بھر کے اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن چیخ پڑے تھے۔ قاتل کی گرفتاری کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ادھر جلیل سخت پریشان تھا۔ زبیر کے ساتھ وہ چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث تو رہا تھا مگر اس کے ہاتھ سے کوئی قتل نہیں ہوا تھا۔ زبیر خود بھی ایسے کام اس کے سپرد نہیں کرتا تھا، جانتا تھا وہ بزدل آدمی ہے مگر بینک ڈکیتی میں اسے اس لیے شامل کیا گیا تھا کہ منصوبہ ہر لحاظ سے مکمل اور بے داغ تھا۔ پولیس کی آمد نے سارا کام بگاڑ دیا تھا۔ یہ ضرور کسی گھر کے بھیدی کی کارستانی تھی۔ زبیر نے اس بھیدی کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر یہاں اور بھی سنگین چکر شروع ہوگیا تھا۔ زبیر نے بڑی رازداری سے جلیل کی بیٹی مومنہ کی تصویر بنائی اور جلیل کی یتیم خانے میں گزاری زندگی سے لے کر اب تک کے واقعات قلمبند کیے۔ زبیر اگرچہ صرف میٹرک پاس تھا مگر اس میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دنیا بھر کے حالات سے باخبر رہتا تھا اسے پتہ تھا اب کونسی چال چلنی ہے، قریبی فون بوتھ جا کر اس نے ملک کے کثیرالاشاعت اخبار کے دفتر فون کیا اس نے اپنا نام نہیں بتایا اور کہا۔

''میں فری لانسر صحافی ہوں۔ جلیل کے بارے میں ایک چونکا دینے والی رپورٹ ہے میرے پاس اگر دام میری مرضی کے ہوں تو میں یہ معلومات فروخت کرنے کو تیار ہوں۔'' ایڈیٹر صاحب مان گئے یوں بھی جلیل ان دنوں ہارٹ کیک بنا ہوا تھا۔ زبیر نے وہ رپورٹ بائی ڈاک روانہ کر دی۔ جلیل اخبار میں اپنے بارے میں نئے انکشافات پڑھ کر بے دم ہوگیا۔ ساتھ رہی سہی کسر مومنہ کی تصویر نے پوری کر دی۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں مفقود ہوگئیں۔ پھانسی کا پھندا ہر دم نگاہوں کے سامنے جھولتا، دو ہفتے گزر گئے تھے مگر پولیس اسی سرگرمی سے اسے تلاش کر رہی تھی ادھر زبیر کے تین ساتھی گرفتار ہوگئے۔ سزا کے خوف سے بچنے کے لیے وہ وعدہ معاف گواہ بننے پر تیار ہوگئے۔ زبیر جلیل کے پاس آ گیا۔

''جلیل یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔''

''میں کہاں جاؤں، پولیس کتے کی طرح میری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔''

''پولیس سے ہی تو بچانا چاہتا ہوں تمہیں۔ تیرے دل میں اگر وعدہ معاف گواہ بننے کا خیال ہے بھی تو نکال دے۔ پولیس حلیہ بگاڑ دے گی تیری بیوی اور بچی رل جائے گی۔ میں نے تمہاری نمک خواری کو بھلایا نہیں ہے ایسے کرو نکلنے کی تیاری کرو، یہ داڑھی مونچھیں یونہی رہنے دو بلکہ ایسا کرو کہ برقعہ اوڑھ لو کوئی نہیں پہچانے گا۔ بھابی مومنہ کو کمبل میں لپیٹ لیں، ثناء کو بھی ساتھ لے جاؤ بن ماں کی بچی کیسے رہے گی۔ یہ رقم احتیاط سے رکھنا۔'' اس نے ہدایات کے ساتھ نوٹوں کی موٹی موٹی گڈیاں اس کی طرف بڑھائیں۔ یہ تقریباً تین لاکھ روپیہ تھا جو اس زمانے میں بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔

زبیر کے نفسیاتی تجربے کامیاب رہے، ساتھ ہی اس نے ثناء سے بھی جان چھڑالی جو اس کے عیش کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ جلیل کی پہلی منزل پشاور تھی۔ بہت جلد زبیر کے ساتھی نے انہیں یہ جگہ چھوڑ دینے کو کہا وہ پھر پنڈی آگئے۔ زبیر بہت چالاک، موقعہ پرست اور خود غرض انسان تھا۔ اسے معلوم تھا اگر جلیل ایک بار پولیس کے قبضے میں چلا گیا تو زبیر کو پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اس نے جلیل کے بارے میں جو رپورٹ ظفر عالم کو بھیجی تھی وہ اسے اپنے کھاتے میں ڈالنے کی فکر میں لگ گیا تھا۔ اس نے بڑی بڑھکیں ماریں کہ جلیل عرف جیلا کی بچی کی تصویر میں نے بڑی مشکل سے حاصل کی ہے۔ زبیر نے جلیل پر احسان عظیم کرتے ہوئے ظفر عالم کو مروا دیا۔ اس نے لازمی طور پر شکر گزار ہونا تھا پھر اس نے جلیل کو نام بدلنے کا مشورہ دیا اور فواد حسن کے نام سے نیا شناختی کارڈ بنوایا۔ وہ اسے پوری طرح اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا تاکہ جلیل کہیں راز نہ اگل دے۔ جلیل بلکہ فواد حسن ساری زندگی بھاگتا رہا، وہ ڈرتا رہا، ڈر ڈر کے زندگی بسر کرتا رہا۔

ثناء کو بھی باپ کی حقیقت کا پتہ چل گیا تھا۔ اس نے خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ زبیر نے بالآخر فواد کو اپنے پاس بلا لیا تاکہ وہ ہمہ وقت نفسیاتی دباؤ میں رہے۔ فواد ایک ہفتہ گھر اور ایک ہفتہ زبیر کے پاس گزارتا۔ اس نے مکمل طور پر اپنا حلیہ بدل لیا تھا پھر زبیر اسے بنکاک لے گیا۔ ثناء سے جب اس کا ملنے کو جی چاہتا تو وہ اسے بلوا لیتا۔ بچی کے دل میں کیا ہے وہ کبھی نہ جان سکا۔ وہ مستقل اسے اپنی ذمہ داری نہیں بنا سکتا تھا۔ ثناء نے ایسا خود غرض اور بے حس باپ نہیں دیکھا تھا جو گھٹیا درجے کی عورتوں کی قربت کے باعث اسے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اسے مکمل باپ بننا پڑتا جو اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

فواد نے جب اسے بتایا کہ ثناء کی بات پکی ہو گئی ہے تو وہ کندھے جھٹک کر رہ گیا جیسے بھاری بوجھ سر سے اترا ہو۔ فواد ہمیشہ کے لیے راحت اور موی کے پاس رہنا چاہتا تھا۔ راحت جب اسے موی کی ناراضگی کا بتاتی تو وہ تڑپ اٹھتا۔ اس کا بس چلتا تو وہ دونوں کو لے کر غائب ہو جاتا۔ موی شکایت کرتی کہ آپ ہمارے پاس زیادہ دن کے لیے کیوں نہیں رہتے جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی یہ سوال اسے تنگ کرنے لگا تھا۔ فواد کے پرس میں ہمہ وقت اس کی تصویر موجود رہتی تھی۔ راحت جب فون یا خط کے ذریعے بتاتی کہ اس نے فلاں گریڈ حاصل کیا ہے اور فلاں کلاس میں آ گئی ہے تو وہ کتنا خوش ہوتا تھا۔

زبیر نے اس سے کہا تھا کہ ثناء کی شادی کے بعد تم راحت اور مومنہ کو لے کر دنیا کے جس حصے میں مرضی چاہے نکل جاؤ۔ اسے زنجیریں ٹوٹنے کا احساس ہوا تھا اسے کیا خبر تھی کہ زبیر کیا سوچ رہا ہے جیسے ہی اس کا طیارہ فضا میں بلند ہوا زبیر کو کسی نے اطلاع دی کہ شیر دل خان کی فائل پھر کھل چکی

ہے۔ پاکستان پہنچتے ہی فواد نے ہوش اڑا دینے والی اطلاع دی کہ اس کا ہونے والا داماد ڈی آئی جی شیر دل کا بیٹا ہے اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ شیر افگن پر جلیل کا راز کھل چکا ہے اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے گھیر کر مار دو اور شاہ کو نکال لاؤ۔

ایسا ہی کیا گیا۔ فواد قریبی مارکیٹ میں زبیر کو فون کرنے آیا تھا اچانک کہیں سے پک اپ نمودار ہوئی اور فواد کو خون میں نہلا کر چلی گئی۔ زبیر کے کارندوں نے وقت ضائع کیے بغیر راحت کو فون کیا اور کہا کہ شاہ کی زندگی کو خطرہ ہے آپ اسے پچھلے دروازے سے نکال دیں۔ راحت نے نہ چاہتے ہوئے دل پر پتھر رکھ کر شاہ کو نکل جانے کو کہا۔ وہ ان کی بیٹی تو نہیں تھی مگر انہوں نے بیٹی کی طرح ہی اسے پالا تھا مومنہ کے فرشتوں کو بھی اس راز کی خبر نہیں تھی۔ راحت نے قیمتی خزانے کی طرح اسے سینت سینت کر رکھا تھا۔ فواد کا حکم تھا کہ موی کو کچھ پتہ نہیں چلنا چاہئے اور واقعی اسے پتہ نہیں چلا تھا سوائے اس کے کہ اس کا باپ قاتل ہے، فراڈ ہے، جواری ہے، اسمگلر ہے۔

شاہ بخیر وخوبی بنکاک پہنچ گئی۔ زبیر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ فواد کو اس نے اپنے مطلب کے لیے زندہ رکھا ہوا تھا وہ جب اس کے مفادات کا تحفظ کرنے کے قابل نہیں رہا تو اس کی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے گئے۔ جرائم کی دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا زبیر اور فواد کا یتیم خانے سے جو سفر شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔ فواد کے قتل کو روزمرہ کی دہشت گردی کی کارروائی قرار دیا گیا پولیس خود بھی سست ہو رہی تھی یوں بھی کونسا وہ محب وطن بے گناہ شہری تھا جو کوئی توجہ دیتا۔

ایک چھوٹی سی غلطی نے اتنے بڑے سانحے کو جنم دیا تھا۔ آگے نہ جانے پردہ غیب سے کیا کیا ظہور میں آنے والا تھا۔ ایک داستان ختم ہو گئی تھی اور دوسری شروع ہونے والی تھی۔

☆☆☆

کراچی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے کے ارائیول لاؤنج سے نکلنے والی وہ لڑکی غم کا مرقع نظر آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس پر پے در پے صدمات کے پہاڑ ٹوٹے تھے۔ کالی شلوار، ہم رنگ قمیص اور کالے ہی دوپٹے نے اس کے حزن وملال میں ڈوبے چہرے کو عجیب سا وقار بخش دیا تھا۔ اس کے پاس صرف ایک ٹریول بیگ تھا جو اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ اس کے بیگ پر لگا ٹیگ بتا رہا تھا کہ وہ بنکاک سے یہاں پہنچی ہے۔ ائیرپورٹ سے باہر نکل کر وہ سڑک کے کنارے کھڑی ہو گئی اور گزرتی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا۔ ڈرائیور کو ڈیفنس کے ایک بنگلے کا پتہ بتا کر وہ تھکے تھکے انداز میں پچھلی سیٹ پر ڈھے گئی...... ڈرائیور شوقین لگ رہا تھا اس کے بیٹھتے ہی کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔

گھر واپس آؤ گے کیا دیکھو گیا پاؤ گے

کون کہے گا کون کہے گا تم بن ساجن

یہ نگری ویران یہ نگری ویران

مسافتوں کی تھکن جیسے اس کے روم روم میں اتر گئی تھی۔ کسی سے ملنے کی خوشی اور غم کے احساسات بیک وقت حملہ آور ہوئے تھے۔ آنسو چپکے سے پلکوں کی باڑھ پھلانگ گئے۔ ڈرائیور کو کرایہ دے کر اس نے دھڑکتے دل سے سیاہ گیٹ کی بیل بجائی۔ اس کی آنکھوں میں بہت ساری دلچسپیاں، وارفتگیاں سمٹ آئی تھیں جیسے بس کھل جا سم سم کہنے کی دیر ہو اور خفیہ خزانوں کے ڈھیر اس کے سامنے لگ جائیں گے۔ واقعی یہ دروازہ اس کے لیے طلسمی اہمیت کا ہی حامل تھا۔ ابھی ایک سال اور چند ماہ ہی تو گزرے تھے مگر اس کے لیے تو صدیاں ہو گئی تھیں۔ قدموں کی آواز دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ ایک اجنبی صورت سامنے تھی۔

''جی فرمایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' نووارد ایک انجان لڑکی کو دیکھ کر مہذب انداز میں بولا۔

''یہاں مسز فواد ہوتی تھیں، کہاں ہیں وہ؟'' اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''ہم نے یہ گھر ایک سال پہلے خریدا ہے معذرت چاہتا ہوں کہ مسز فواد کے بارے میں مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔'' اس نے کھٹاک سے گیٹ بند کر لیا تو اسے یوں لگا کہ جیسے ہر روزن بند ہو گیا ہو مگر نہیں، امید کی ایک کرن باقی تھی۔ وہ نئی توانائی سے ساتھ والے گیٹ کی بیل بجانے لگی۔ ملازم ٹائپ سا لڑکا باہر نکلا۔

''جی بی بی جی۔'' وہ اس کی قیمتی لباس سے مرعوب ہو گیا۔ لگ رہا تھا کہ نیا ملازم ہے خدا بخش کو وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

''شیر افگن ہیں۔''

''نہیں بیگم صاحب وہ حیدرآباد گیا ہوا ہے۔''

''اچھا باقی گھر والے تو ہیں ناں؟''

''باقی کون گھر والے، صاب اکیلا رہتا ہے۔''

''ان کی ممی، دادا اور بہن۔'' وہ جھلا گئی۔

"بیگم صاب مجھے نہیں پتہ صاب حیدر آباد گیا ہوا ہے واپس آئے گا تو آنا۔"

دوسرا دروازہ بھی بند ہو گیا تو اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ "سمیر ملک" جگنو کی طرح یہ نام ذہن میں جگمگایا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ وہ تھانے میں مل جائے ورنہ اسے بڑی پرابلم ہوتی۔ سمیر ملک کو پوچھنے پر سپاہی ایک دم مؤدب ہو گیا اور اسے احترام سے کرسی پیش کی۔ وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ سمیر کو اسے دیکھتے ہی شاک سا لگا مگر اس نے سیکنڈوں میں اپنی حیرت پر قابو پا لیا۔

"مس ثناء کیسی ہیں آپ؟" وہ کیپ اتار کر اس کے سامنے ٹک گیا۔

"ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟" رسمی طور پر خیریت دریافت کی گئی۔

"شیر افگن صاحب کیسے ہیں؟"

"مزے کر رہے ہیں، ضروری کام کے سلسلے میں حیدر آباد میں ہیں۔"

ثناء کو سمیر کا لہجہ اس کے ذکر پر کڑوا سا لگا یا پھر شاید یہ اس کا وہم تھا اس نے سر جھٹکا۔

"اچھا آنٹی، دادا جان اور بلوشہ کیسی ہیں۔ ادھر ہمارے گھر نہیں گئے کبھی آپ؟ میرا مطلب ہے امی اور موی سے تو آپ کی ملاقات ہوتی رہتی ہو گی؟" سمیر نے غور سے اسے دیکھا۔ یہ لڑکی اداکاری تو نہیں کر رہی تھی کہیں اس کی نگاہیں دھوکہ تو نہیں کھا رہی تھیں۔

"آپ کہاں ٹھہری ہیں؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا۔ میں گھر سے ہو کر آ رہی ہوں وہاں نئے لوگ آ گئے ہیں۔ میں اسی جستجو میں یہاں آئی ہوں۔" واقعی اس کے لہجے اور آنکھوں میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔

"ثناء میں جو خبر آپ کو سنانے جا رہا ہوں حوصلے سے سننے گا۔" اس نے بات کا آغاز کرنے کی لیے مناسب لفظ تلاش کیے۔

"ثناء جس روز جلیل یا فواد کا قتل ہوا اسی روز آپ کی امی بھی......" اس نے جملہ پورا نہیں کیا۔

"ہوش میں ہیں آپ یا مذاق کر رہے ہیں۔ اگر یہ مذاق ہے تو بہت گھٹیا، میں سب کشتیاں جلا کر یہاں پہنچی ہوں۔" شدت ضبط سے ثناء نے دونوں ہاتھوں سے سامنے پڑے ٹیبل کو پوری قوت سے تھاما۔

"ثناء آپ کی امی اس دنیا میں نہیں ہیں اور موی بھی تقریباً ایک سال سے غائب ہے۔ اصل میں شیر افگن نے اس کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ آنٹی درو شے اور دادا جان بھی زندہ نہیں ہیں۔" تکلیف دہ حقیقت نے اس کی آنکھوں کو پانیوں سے بھر دیا۔ اس نے حلق سے نکلنے والی چیخوں کو آزاد کر دیا۔

"پلیز ثناء چپ ہو جائیں۔" سمیر گھوما اور اس کی پشت پر پہنچا اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

اس نے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا سمیر کا بازو پکڑے اس کے کندھے سے لگے ثناء نے دل کی بھڑاس نکالی۔ آہستہ آہستہ وہ نارمل ہو گئی۔

"یہ شادی کیسے ہوئی؟ آئی مین موی اور شیر افگن کی شادی؟"

''آنٹی نے اسے زبردستی مجبور کیا تھا مگر اس وقت اس نے انکار کر دیا بعد میں نہ جانے کیسے وہ راضی ہو گیا۔ میں بھی شادی کے نام پر کھیلے جانے والے ڈرامے میں شریک ہوا تھا۔ صبح صبح موصوف نے فرمایا کہ موی گھر سے غائب ہے۔'' سمیر جلے بھنے انداز میں تفصیل بتانے لگا۔ وہ غور سے سن رہی تھی۔ ''شیر نے انتقاماً یہ شادی رچائی۔ وہ آپ کی گمشدگی کا قصوروار بھی اسے ٹھہرا رہا تھا اور کہتا تھا کہ میں موی سے ثناء کا پتہ اگلوا کر رہوں گا۔ ایک مزے کی بات بتاؤں اسے موی کی گمشدگی کی بالکل پروا نہیں ہے میں اس کی بے فکری دیکھ کر حیران ہوتا ہوں شاید کندھے پر لٹکنے والے نئے اسٹارز نے اسے کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ میں اس صورت حال سے چکرا کر رہ گیا ہوں۔''

ثناء کے چہرے سے فکرمندی مترشح تھی۔

''گویا میرے حصے کی سزا دوسرے بھگتتے رہے ہیں مگر اب اور نہیں میں آ گئی ہوں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''ثناء آپ کہاں رہیں؟ کیوں گئیں؟ بتائیں ناں۔'' ثناء نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ یقیناً وہ اس پر اعتماد کر سکتی تھی۔

''سمیر میں جو کچھ کہوں گی اسے مذاق مت سمجھنے گا یہ میری زندگی کا کڑوا سچ ہے۔ مجھے دکھ ہو رہا ہے کہ میں امی اور موی کو چھوڑ کر کیوں گئی۔ کاش میں نہ جاتی۔'' پھر اس نے بولنا شروع کر دیا۔ سمیر حیرت کے عالم میں آنکھیں پھاڑے سنتا رہا اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ثناء پھر رونے لگی تھی۔ سمیر نے اس کے ٹریول بیگ سے نکالا گیا بھاری اور موٹا خاکی لفافہ آہنی سیف میں رکھا اور ثناء کو اٹھنے کا اشارہ کر کے باہر آ گیا۔

''ثناء میرے گھر میں ایک بیوہ بہن اور اس کی بیٹی ہے۔ امی ابو گاؤں میں ہوتے ہیں نہ جانے میرے گھر میں آپ ایزی فیل کریں بھی یا نہیں۔''

ثناء نے تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سمیر کی بہن اس سے تپاک سے ملیں۔ اس نے الگ لے جا کر مختصراً اس کے بارے میں بتایا پھر دوبارہ انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا۔

''سمیر! موی کو میں کہاں تلاش کروں؟'' ثناء بہت پریشان تھی وہ خود اس سوال سے الجھ گیا تھا اس ایک سال میں اس نے اپنے طور پر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ معاملہ وہیں رکا ہوا تھا۔

''ثناء جلیل صاحب میرا مطلب ہے کہ فواد صاحب نے آپ سے کبھی اپنے کسی رشتے دار کا ذکر نہیں کیا کبھی۔''

''وہ یتیم خانے سے بھاگے تھے اس کا علم مجھے اخبارات سے ہوا یا پھر زبیر صاحب سے۔ مگر اس بات کا موی سے کیا تعلق ہے؟''

''نہیں تعلق تو نہیں ہے میں ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔'' اس نے اسے ٹالا۔ جس یتیم خانے سے جلیل بھاگا تھا وہ لاہور میں تھا اس کا ایڈریس سمیر نے نوٹ کیا اور چھٹی لے کر لاہور فلائی کر گیا۔ اس کا آئی ڈی کارڈ دیکھتے ہی نگران نے تمام پرانا ریکارڈ اس کے سامنے ڈھیر کر دیا۔ سمیر کو مطلوبہ نام مل گیا۔ اسے یہاں لانے والے کا نام اور ایڈریس بھی لکھا ہوا تھا۔

''جلیل نامی بچے کے ساتھ جو چیزیں لائی گئی تھیں کیا وہ تمہارے ریکارڈ میں محفوظ ہیں؟'' نگران نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ایک بنڈل سا ڈھونڈ کر لایا جس میں بچے کے کپڑے، اس وقت کی ایک عدد کھینچی گئی تصویر اور ایک پرچہ تھا۔ سمیر پرجوش ہو گیا۔ پہلی فلائٹ ملتے ہی وہ واپس آیا۔ اسے بات بنتی نظر آ رہی تھی ثناء موی کی گمشدگی سے بےحد پریشان تھی۔

''دیکھیں شاہ، شیر افگن کی بے فکری یہ بتاتی ہے کہ موی جہاں کہیں بھی ہے وہ اس جگہ سے واقف ہے۔''

''پھر وہ بتاتا کیوں نہیں ہے، وہ کہاں ہو سکتی ہے؟''

''ایسی جگہ جو شیر افگن کے خیال میں محفوظ ترین ہو۔'' وہ پرسوچ انداز میں بولا۔

''ہوسکتا ہے اس نے کوئی الگ گھر لے کر موی کو وہاں رکھا ہو۔''

''نہیں میں اس مفروضے کو نہیں مانتا بہر حال جلد ہی کچھ کرنا پڑے گا فی الحال میں مارکیٹ جا رہا ہوں آپ نے کچھ منگوانا ہو تو بتا دیں۔'' وہ سامان کی لسٹ جیب میں ٹھونس کر بولا۔

''نہیں کچھ نہیں منگوانا مجھے۔'' وہ اندر چلی گئی۔ آپا نے سمیر کو مشورہ دیا تھا کہ اس لڑکی سے شادی کر لو۔ اسے بہت ہنسی آئی تھی بھلا کہاں وہ چند ہزار کمانے والا سرکاری نوکر اور کہاں وہ اربوں کی جائیداد کی مالک زمین اور آسمان کا سنگم ناممکن ہی تھا۔ یوٹیلیٹی سٹور سے اس نے سارا سامان خرید کر ٹرالی میں رکھا اور کاؤنٹر پر ادائیگی کرنے آیا۔

''سمیر بیٹے! کیسے ہو بڑے عرصے بعد نظر آئے ہو۔'' جانی پہچانی آواز سن کر وہ گھوما۔ وہ بابا خدا بخش تھے شیر افگن کے پرانے نوکر۔ اس نے سرسری سا بتایا تھا کہ وہ نوکری چھوڑ کر چلے گئے ہیں آج بہت روز بعد روبرو ان سے ملاقات ہو رہی تھی وہ سگے باپ کی طرح ان کا احترام کرتا تھا اس لیے وہ بھی اسے بڑی محبت دیتے تھے۔

''بابا چلیے چھوڑ آؤں آپ کو۔'' خدا بخش اب اپنے بیٹے کے پاس چلے گئے تھے۔ وہ تو مالکوں کی محبت میں شیر دل ہاؤس چھوڑنے پر تیار ہی نہیں ہوتے تھے یہی سوال سمیر نے اس وقت ان سے کیا۔ چند منٹ وہ خاموش رہے جیسے الفاظ ترتیب دے رہے ہوں۔

''بیٹا میں نے عمر کا زیادہ حصہ بڑے صاحب شیر دل خان کے گھر گزارا، کبھی کوئی اونچ نیچ نہیں ہوئی نہ کسی نے ہمیں نوکر سمجھا بس بیگم صاحبہ کے مرتے ہی عجیب غریب واقعات رونما ہونے لگے۔''

''کون سے واقعات بابا۔'' سمیر نے مہارت سے موڑ کاٹا اور ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں ایک روز گیراج میں گھاس کاٹنے والی مشین لینے گیا تو چیخوں کی آواز سنائی دی۔ بہت مدھم مدھم گھٹی گھٹی سی چیخیں تھیں۔ تہ خانے سے آرہی تھیں میں نے چھوٹے صاحب سے ذکر کیا تو وہ ناراض ہو گئے کہ بابا آپ سٹھیا گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہو نہ ہو کوئی بدروح بھوتوں کا چکر ہے۔ میں ایک پیر بابا کو جانتا ہوں اسے لے کر آؤں تا کہ وہ گھر کو بدروحوں سے پاک کر دے۔ صاحب نے میری ایک نہ سنی۔ مجھے تو رات سوتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ کہیں کوئی جن میرا گلا نہ دبا دے میں نے حضور بخش سے ذکر کیا تو وہ رونے لگا اور کہا کہ ابھی تم چلے آؤ کوئی بدروح چمٹ گئی تو خیر نہیں ہے۔ میں چھوٹے صاحب سے معافی مانگ کر آ گیا۔ آج کل حضور بخش کے ساتھ رہ رہا ہوں بڑے آرام سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ چھوٹے صاحب نے اتنا کچھ دیا ہے کہ میں ان کا احسان ہی نہیں اتار سکوں گا۔'' خدا بخش کی منزل آ گئی وہ اسے دعائیں دیتے اتر گئے۔ سمیر چند منٹ اسٹیئرنگ پر سر ٹکائے کچھ سوچتا رہا۔ قدرت اس کی مدد پر تلی ہوئی تھی۔ آپا رات جلدی سو گئیں۔ سمیر نے ان کے سونے کا اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد شاہ کے کمرے کے دروازے پر آہستگی سے دستک دی۔

''آجائیں آپا۔'' وہ بے تکلفی سے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ ان کی جگہ سمیر کو دیکھا تو بے طرح شرمندہ ہوئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ثناء، مومنہ کا پتہ چل گیا ہے۔''

''کیا!'' ثناء کی چیخ بے ساختہ تھی۔ سمیر نے فوراً اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''یہ کیا کر رہی ہیں قبر کے مردوں کو جگانے کا پروگرام ہے۔'' وہ ناراضگی سے بولا اور اپنا ہاتھ ہٹالیا۔ ثناء ایک بار پھر شرمندہ ہوگئی۔

''اچھا کہاں وہ؟'' وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔ وہ سرگوشیوں میں اسے اپنا لائحہ عمل بتانے لگا وہ سر ہلاتی گئی۔

''اگر شیر افگن صاحب لوٹ آئے تو.....'' اس نے اس پہلو کی طرف توجہ دلائی۔

''دیکھا جائے گا۔ ہمیں ایک بے گناہ لڑکی کی ہر حال میں مدد کرنی ہے۔ وہ مظلوم بھی ہے اوپر سے شیر افگن جیسے برتری وانتقام کے زعم میں چور مرد کے قبضے میں ہے۔''

''آپ نے خدا بخش سے پوچھا نہیں کہ اس نے وہ چیخیں کب سنی تھیں؟''

''ہاں بتا رہا تھا وہ بیگم صاحب کے مرنے کے کچھ سات ماہ بعد اس نے نوکری چھوڑی۔''

''گویا اس نے نو دس ماہ پہلے چیخیں سنیں اور مومی کی شادی کو تقریباً ایک سال ہونے والا ہے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندہ بھی ہوگی۔'' ثناء کا سوال بہت کڑا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہوگی۔ شیر اسے سسکا سسکا کر مارنا چاہتا ہوں گا اتنی جلدی نہیں جان چھڑائے گا۔'' سمیر کا لہجہ دکھ سے بوجھل تھا۔ ثناء دھیرے دھیرے رونے لگی۔

''اس نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ اس کی قمیص کا گریبان تھام گئی۔

''بتایا تو ہے کہ وہ اسے اپنے باپ کے قاتل کی نشانی سمجھتا ہے۔ کہتا تھا کہ اس کی آنکھیں اور پیشانی دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا ہے۔'' ثناء آنسو بہانے لگی۔

''سمیر جب مجھے اس بات کا علم ہوا کہ شیر افگن کا پروپوزل میرے لیے آیا ہے تو میں سب کچھ بھول کر خوش ہوگئی تھی کہ میرے دکھ کے دن ختم ہوگئے ہیں۔ میں اب شکر کرتی ہوں کہ میری شادی اس سے نہیں ہوئی حقیقت کھلنے پر وہ مجھے جان سے مار دیتا جب میرے باپ کے اتنے کارناموں کا اسے پتہ لگتا تو میرا کیا حشر ہوتا۔ میرے دل میں اس کے لیے نفرت بھری ہے اس نے میری معصوم سی بہن کو کس اذیت میں رکھا ہوگا۔ آپ بہت اچھے ہیں اس سے بہت مختلف اور الگ کسی فرشتے جیسے۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے انسان ہی رہنے دیں، فرشتوں کو آسمان پر ہی چھوڑیں۔'' وہ اسے ہلکا پھلکا کرنے کی خاطر مسکرایا۔

''اچھا ثناء، سویٹ اب کل ہمارا معرکہ ہوگا گڈ نائٹ۔'' وہ دروازے پر پہنچ کر مڑا۔ ثناء اسے ہی دیکھ رہی تھی نگاہیں ملنے پر رخ موڑ گئی وہ اس احتیاط بھری ادا پر مسکرا دیا۔

☆☆☆

گل بادشاہ سمیر ملک کو پہچانتا تھا۔کئی بار وہ اس کے صاحب کے ساتھ گھر آ چکا تھا چنانچہ جب اس نے اس کی گاڑی کو دیکھا تو بلا تامل گیٹ کھول دیا۔ثناء سمیر کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔گل بادشاہ کی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں وہ اسے پہچان چکا تھا۔

''بھئی گل بادشاہ ہم نے اس کے ساتھ نیا نیا شادی بنایا ہے کہتی ہے کہ میں بھی گل بادشاہ سے ملوں گی۔میں نے بتایا کہ تم پشاوری قہوہ بہت زبردست بناتے ہو، ہم وہی پینے آئے ہیں۔'' گل بادشاہ اس پذیرائی پر آسمان پر اڑنے لگا تھا جبکہ ثناء جھینپ گئی تھی۔سمیر اب اس راز سے آگاہ ہوا کہ شیر افگن نے چوکیدار کے سوا تمام نوکروں کو چھٹی کیوں دے دی تھی بلکہ چوکیدار بھی نیا تھا۔ایک بار اس کی آمد پر گل بادشاہ نے سمیر کو قہوہ پلایا تو اس نے بڑی تعریفیں کیں جس سے گل بادشاہ کا مان بڑھ گیا تھا۔

وہ گیٹ بند کر کے اپنے کوارٹر میں آیا۔سمیر نے ریوالور کا دستہ اس کے گھومتے ہی اس کی کھوپڑی میں مارا اور وہ اوغ کی آواز نکالتے ہوئے فرش پر گرنے لگا تھا۔سمیر نے سنبھال کر بستر پر لٹا دیا۔احتیاطاً اس نے چوکیدار کے منہ پر ٹیپ لگا کر ہاتھ پیر باندھ دیے۔اب وہ ہوش میں آ کر شور نہیں مچا سکتا تھا۔''سوری گل بادشاہ اس حرکت کے لیے۔'' وہ اس کی بے ہوش وجود کو دیکھتا باہر نکل آیا۔گیراج کا دروازہ بند تھا۔موٹا سا وزنی تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔سمیر اس کا انتظام کر کے آیا تھا۔اس نے جیب سے مختلف چابیوں کا گچھا سا نکالا اور تالے کے سوراخ میں گھما کر چیک کرنے لگا۔چوتھی چابی پر کلک کی آواز آئی۔اس کا چہرہ چمک اٹھا تالا کھل چکا تھا۔

اس نے ثناء کو ٹارچ بجھانے کا اشارہ کیا پھر دونوں اندر داخل ہو گئے۔ثناء کا پیر کسی چیز پر سے پھسلا اور وہ گرتے گرتے بچی۔سمیر نے اسے سنبھالا دیا۔اس افراتفری میں ٹارچ ثناء کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔سمیر موم بتیاں بھی لایا تھا وہ جلا کر اس نے ٹارچ ڈھونڈی۔ٹیوب لائٹ جلا کر وہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

وہ تہ خانے کے دروازے پر بھاری کاٹھ کباڑ پڑے دیکھ کر حیران ہوا...... موی کی آواز باہر نہ آجائے۔اس خیال سے اس نے یہ فالتو سامان گیراج میں پھینکا تھا۔شیر دل ہاؤس تعمیر کراتے وقت تہ خانے کی تعمیر کہیں بھی شامل نہیں تھی۔ایک جگہ سے زمین بہت نیچی تھی نقشہ نویس نے کہا کہ اس قطعہ زمین کی بھرائی کروا کر تعمیر کرانے کے بجائے تہ خانہ بنوا لیں جو گرمیوں میں ٹھنڈا ہوتا ہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔سنگین خان نے سوچا تھا کہ گرمی کے موسم میں کبھی کبھار وہاں ڈیرہ لگایا کریں گے مگر ایک بار جانے کے بعد وہ تائب ہو گئے۔ان کا دم گھٹ رہا تھا شاید اس لیے کہ وہاں روشنی کا انتظام نہیں تھا حالانکہ سوئچ بورڈ اور بلب ہولڈر کی جگہ بنی ہوئی تھی وہ خود ہی سست پڑ گئے تھے چنانچہ تہ خانہ بند کر دیا گیا۔اس کا راستہ گیراج سے ہو کر گزرتا تھا۔گزرگاہ پر گول ڈھکن لگا ہوا تھا جو لوہے کا بنا ہوا تھا اور خاصا مضبوط تھا ایک وقت میں ایک ہی آدمی نیچے اتر سکتا تھا ہاں اسمارٹ قسم کے دو آدمی بیک وقت داخل ہو سکتے تھے۔سمیر نے ثناء کو ٹارچ پکڑائی اور ڈھکن کے اوپر سے سامان ہٹانے لگا۔اس کام میں پینتالیس منٹ لگے کیونکہ وہ کوشش کر رہا تھا آواز پیدا نہ ہو اس لیے اتنی دیر لگی۔

بالآخر سمیر نے آہنی ڈھکن اٹھایا۔ثناء اس کے پیچھے تھی اس نے سیڑھی پر مضبوطی سے قدم جمایا اور اتر ا ثناء ڈر گئی یہ سب اسے خوفناک خواب کا حصہ لگ رہا تھا اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کاش سمیر کے مفروضات جھوٹے ہوں۔چوتھی سیڑھی پر اچانک اس کا پاؤں رپٹا اس کی وجہ سے وہ بھی گرتے

گرتے بچا اس نے شاہ کا سہارا لے کر خود کو متوازن کیا۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ رک گئی۔

''پلیز آیئے، منزل پر پہنچ کر یہ کیسی مایوسی ہے، ہمت کریں کچھ نہیں ہوگا پلیز۔'' سمیر نے جرأت سے کام لیتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ شاہ نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا لکھی ہوئی تھی۔ سیڑھیاں ختم ہوگئیں سمیر کے ہاتھ میں پکڑی پینسل ٹارچ کا دائرہ گھومنے لگا۔ نیچے زمین پر خالی گلاس اور چند پلیٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ دیوار کے ساتھ نل بھی لگا ہوا تھا جو پوری طرح بند نہ ہونے کے باعث ٹپک رہا تھا۔ اس سکوت میں ٹپ ٹپ کی آواز موت کا سا بھیانک تاثر پیدا کر رہی تھی۔ روشنی کا دائرہ ذرا اور آگے ہوا۔ انہیں بہت سارے ڈبے پڑے دکھائی دیے ذرا اور آگے ایک جوتا پڑا ہوا تھا۔ ''الٰہی خیر۔'' شاہ نے دہل کر سمیر کا بازو پکڑ لیا۔ اچانک اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا۔ بے اختیار اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ وہ موم بتیوں کا پیکٹ تھا جس سے اس کا پاؤں ٹکرایا تھا اپنی بزدلی پر اس نے دل میں خود کو ملامت کی سمیر اور آگے ہوا اب روشنی کا دائرہ ساکت ہوگیا تھا۔

''شاہ موم بتی بھی جلا لیں۔'' اس نے اندرونی ہیجان کو دباتے ہوئے کہا۔ موم بتی جلنے سے تاریکی قدرے چھٹ گئی۔ نیچے زمین پر بچھی دری پر ایک بے ترتیب وبے جان جسم پڑا تھا جس کا چہرہ دیوار کی سمت تھا۔ سمیر نے ٹارچ شاہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اپنی طرف اس کا چہرہ گھمایا۔ ہفت آسمان اس پر آپڑے وہ موحی کا ڈھانچہ تھا بشرطیکہ اسے موحی کہا جاسکے۔ شاہ تاب نہ لاتے ہوئے مارے خوف کے سمیر سے آلپٹی ٹارچ اور موم بتی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

''شاہ پلیز! کمپوز یور سیلف۔'' وہ غرایا اور جھٹکے سے اسے الگ کیا۔ ''پکڑیں یہ موم بتی اور ٹارچ، وقت نہیں ہے۔'' موحی کے پرحرارت جسم سے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ابھی اس میں زندگی کی رمق باقی ہے۔ شاہ اس کے درشت لہجے سے خائف ہوکر جلدی جلدی اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگی۔ سمیر نے موحی کو اٹھالیا اور شاہ کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ خدا خدا کر کے وہ اس اندھیری قبر سے نکلے۔ گیراج کا دروازہ کسی کو بھی بند کرنے کا ہوش نہیں رہا نہ ہی گل بہادر کو کھولنے کا۔ موحی کو اس وقت کسی ہاسپٹل میں نہیں لے جایا جاسکتا تھا سمیر نے اللہ کا نام لے کر ارباز کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ اس سے کئی بار ملا تھا اب تو ان میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔

''ہیلو ارباز بھائی میں سمیر بول رہا ہوں۔ آپ ابھی اور اسی وقت جس حال میں بھی ہیں فوراً اپنے کلینک آجائیں میں بھی اپنی گاڑی آپ کے کلینک کی طرف موڑ رہا ہوں اور ہاں پلوشہ بہن کو کچھ مت بتایئے گا۔'' سمیر نے اسے سوال جواب کا موقع دیے بغیر فون بند کردیا۔ ارباز نے ساتھ پڑی پلوشہ کی طرف دیکھا وہ بے سدھ سو رہی تھی دائیں طرف اس کے چند ماہ کے بیٹے کا بستر پڑا تھا وہ بھی سو رہا تھا۔ ارباز نے کپڑے بدل کر گاڑی کلینک کی طرف دوڑالی۔ سمیر کے ساتھ شاہ کو دیکھ کر اسے عجیب سا احساس ہوا۔ صحیح معنوں میں ارباز کے سر پر جیسے بم پھٹا۔ موحی کو دیکھ کر۔

''یہ...... یہ تمہیں کہاں سے ملی۔'' حیرت کی زیادتی کے باعث اس کی آواز سرگوشی میں ڈوب گئی۔

''ارباز بھائی سب بتادوں گا، پہلے اسے دیکھ لیں۔''

شاہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ گاہے بگاہے وہ دیوار گیر گھڑی پر بھی نظر دوڑا لیتی جہاں اس وقت رات کے تین بج رہے تھے اس کی طرح

سمیر بھی بے چین تھا۔ کتنے گھنٹے گزر گئے۔ ارباز باہر نہیں آیا۔ حتیٰ کہ پو پھٹنے لگی۔ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ دھیرے سے دروازہ کھلا ارباز برآمد ہوا۔

''تم لوگ گھر جاؤ نیند پوری کرو شام کو آنا میں نے ڈاکٹر نصر کو فون کر دیا ہے۔'' اس نے ساتھی ڈاکٹر کا نام لیا۔

''کیا پوزیشن ہے۔'' سمیر بے تابی سے بولا۔

''میں کہہ رہا ہوں نا گھر جاؤ شام کو آنا آرام سے بات کریں گے۔'' اس نے سمیر کا کندھا سہلایا۔

''ارباز بھائی پلوشہ بھابی یا شیر کو علم نہ ہونے پائے میں آپ کو ساری بات بتا دوں گا۔'' جاتے جاتے وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر التجائیہ انداز میں بولا۔ سات بجے کے قریب وہ لوٹے تو انتظار کرتی بہن کو دیکھ کر انہیں بے حد شرمندگی ہوئی۔ سمیر نے انہیں سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

''آپا، مومنہ ان کی بہن مل گئی ہے۔ ہم اسے ہاسپٹل ایڈمٹ کروا کر آ رہے ہیں۔'' وہ باقی قصہ گول کر گیا۔ تھکے تھکے جسم کے ساتھ شاہ لیٹ گئی۔ رت جگے کے باوجود نیند آنکھوں سے روٹھی رہی حالانکہ گزشتہ رات اس کی زندگی کی انوکھی ترین رات تھی۔ بھیانک اور رازوں سے پردہ اٹھانے والی رات، دل کو چیر کر رکھ دینے والی رات، لہو رگوں میں جما دینے والی رات۔ اس نے تھوڑی دیر پیشتر سمیر سے عہد کیا تھا کہ وہ اب نہیں روئے گی مگر کیا واقعی یہ اتنا آسان تھا۔ وہ بدعہدی کر گئی تھی موی کا موت کی زردی سے پتھرایا چہرہ آنکھوں کی پتلیوں میں نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ ادھر سمیر بھی اسی قسم کے احساسات سے دوچار تھا اس نے جب مومنہ کو اٹھایا تو یوں محسوس ہوا جیسے ہڈیوں کے ڈھیر کو اٹھا لیا ہو۔ اس کے جسم پر برائے نام گوشت تھا۔ جیسے ہڈیوں پر کھال چپکی ہو۔ یہ وہ والی موی تو نہیں تھی جس اس نے فٹ پاتھ پر کھڑے بے فکری سے مسکراتے دیکھا تھا۔ وہ والی موی تو سراپا زندگی تھی امنگ تھی، امید تھی۔ یہ والی موی کیا تھی موت کی طرح تاریک اور خاموش تھی۔ اس موی کو دیکھ کر زندگی انگڑائی لیتی محسوس ہوتی تھی اس موی کو دیکھ کر زندگی شرما گئی تھی وہ والی موی تو ستاروں، کلیوں، پھولوں، صبا، چاندنی اور کہشاں سے گندھی گئی تھی اس کی گلابی رنگت میں کتنے دیئے جگمگ کرتے نظر آتے تھے۔ اس کے لبوں پہ زندگی رقصاں تھی پلوشہ کی شادی میں اسے دیکھ کر کتنے نوجوانوں کے لبوں سے ٹھنڈی آہیں خارج ہوتی تھیں۔

''شیر میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں پورا بدلہ لوں گا تم اتنے شقی القلب تو نہ تھے میں سمجھتا تھا کہ تمہیں نرمی و مروت اور حلاوت کے خمیر سے گوندھا گیا ہے تم تو کسی کو ناحق تکلیف پہنچانے کے قائل نہیں تھے قدم بچا بچا کر چلتے کہ کوئی چیونٹی پاؤں کے نیچے نہ آ جائے۔ تم کتنا دھیان رکھتے تھے کہ تمہاری وجہ سے کسی کا دل نہ دکھے، کسی کی آنکھ میں آنسو نہ آئیں۔ میں تمہارے ساتھ رہا ہوں مگر پھر بھی تمہیں پہچان نہ سکا شاید میں انسان شناس نہیں ہوں۔ موی کو تو نا قابل تلافی نقصان پہنچ چکا ہے مگر میں تمہیں ایسا عظیم نقصان پہنچاؤں گا کہ تم تمام عمر یاد کرو گے۔ موی پہ اذیتوں کے پہاڑ توڑ کر تم نے اچھا نہیں کیا ہے۔ بظاہر تو تم کتنے اونچے اور نا قابل تسخیر لگتے ہو مگر درحقیقت کتنے بودے ہو۔ ایک عورت بلکہ ایک نازک لڑکی کو مشق ستم بنایا تف ہے تمہاری مردانگی پر لعنت ہے تمہاری جوانی پر حیف ہے تمہاری طاقت پر۔'' وہ بار بار مٹھیاں کھول اور بند کر رہا تھا۔

☆☆☆

شیر افگن نے کئی بار ہارن بجایا مگر گیٹ کھلنے کے کوئی آثار نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھار بادشاہ سگریٹ خریدنے قریبی سٹور پر چلا جاتا تھا مگر ایسی صورت میں اس کی کرسی گیٹ کے باہر رکھی نظر آتی تھی۔ آج وہ بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جھنجلا کر نیچے اترا چھوٹا درمیانہ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ شیر افگن بادشاہ گل کی پناہ گاہ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اسے بندھے پڑا دیکھ کر اس کے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہ تھا کہ شاید اس کے گھر میں ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔ اطراف میں سرسری دیکھنے پر ایسے کوئی آثار لگ تو نہیں رہے تھے۔ شیر افگن نے اس کے منہ پر چپکا ٹیپ ہٹایا اور جلدی جلدی ہاتھ پاؤں کی بندشیں کھولیں۔

''بادشاہ گل یہ سب کیا ہے کس نے تمہارا یہ حال کیا ہے۔'' وہ جانتا تھا کہ چوکیدار بے خبری کی مار کھانے والا نہیں ہے۔ ہٹا کٹا تندرست و توانا تھا۔ دو تین آدمیوں سے تو آرام سے بھڑ سکتا تھا۔ بادشاہ گل نے لمبے لمبے سانس بے تابی سے بھرے۔

''صاب! وہ آپ کا دوست سمیر صاب آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھا۔'' اس نے تفصیل بتائی تو شیر افگن سوچوں میں ڈوب گیا۔ سمیر چوروں کی طرح کیوں آیا تھا۔ پھر اس کے ساتھ وہ لڑکی کون تھی۔ ان کا یوں آنے کا مقصد کیا تھا وہ تو کہہ رہا تھا کہ وہ لڑکی پہلے بھی اس کا پتہ کرنے آئی تھی، تیر کی طرح ایک خیال آیا۔ وہ بے تحاشا گیراج کی طرف بھاگا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا تہ خانے کے دروازے پر سے سامان ہٹا ہوا تھا۔ افراتفری کا سا سامان تھا۔ اس کی پیشانی کی لکیروں میں اضافہ ہو گیا۔ ایمر جنسی لائٹ لے کر وہ تہ خانے کی سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ زمین پہ بچھی دری خالی تھی۔ پنجرہ خالی تھا، پنچھی اڑ چکا تھا۔

''سمیر میرے پرسنل افیئرز میں کوئی بھی انٹرفیئر نہیں کر سکتا۔ میں اس مداخلت کا مزہ چکھا دوں گا۔ اب جو ہو گا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' اس کے لبوں پہ سنگدلانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

☆☆☆

''آپا سمیر کہاں ہے۔'' وہ آرام کیے بغیر اس کے گھر چلا آیا تھا۔

''افگن وہ ہاسپٹل گیا ہوا ہے۔''

''کون سے ہاسپٹل میں؟'' اس کا لہجہ کسی بھی تجسس سے خالی تھا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتہ۔'' اور واقعی اس بار وہ سچ بول رہی تھیں۔

''اچھا آپ کے گھر مہمان کون آیا ہوا ہے؟'' اس نے ترپ کا پتہ پھینکا۔

''وہ شاہ آئی ہے بے چاری بڑی مظلوم لڑکی ہے۔'' بات کہہ جانے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

''میں بیٹھ کر سمیر کا انتظار کر لوں۔''

''ہاں! ہاں کیوں نہیں تمہارا اپنا گھر ہے۔ بیٹھو میں چائے لاتی ہوں۔'' وہ خوش دلی سے بولتیں کچن میں گھس گئیں شیر افگن نے سامنے پڑا

میگزین اٹھا لایا اور ورق گردانی کرنے لگا۔ اس سے دل بھر گیا تو ٹی وی کھول لیا جہاں موسیقی کا پروگرام چل رہا تھا۔ وہ مارے باندھے دلچسپی لے رہا تھا گلوکار کیا گا رہا تھا اسے کوئی غرض نہیں تھی۔ ذہن سمیر کی طرف اٹک گیا تھا۔ نہ جانے وہ اسٹوپڈ سی لڑکی کس حال میں ہو گی جو اسے ہاسپٹل لے جانا پڑ گیا ہے۔ درد سر بنتی جا رہی ہے۔ مجھے حیدر آباد میں شاید زیادہ دیر لگ گئی ہے۔ مجھے جلدی واپس آنا چاہئے تھا۔" وہ اندر ہی اندر سوچ رہا تھا اسی حالت میں اڑھائی گھنٹے گزر گئے۔

ثومیہ رات کے کھانے کے لیے چکن صاف کر رہی تھیں لہسن اور پیاز پہلے سے انہوں نے کاٹ لیا تھا۔ شیر افگن کی موجودگی کے خیال سے انہوں نے کباب اور چکن بریانی بھی تیار کر لی تھی۔ چاول صاف کیے رکھے تھے۔ کبابوں کو صرف تلنا تھا۔ باہر گاڑی کی آواز سن کر شیر افگن نے اطمینان کی سانس لی ثومیہ نے سمیر کو بتایا کہ اندر تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔

"صبر نہیں ہو سکا صاحب بہادر سے۔" وہ آہستگی سے ثناء سے مخاطب ہوا ذہن پہ پہلے ہی بوجھ تھا۔ اب جان جلانے کو یہ چلا آیا تھا اور ابراز موی کے بارے میں زیادہ پر امید نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ "مومنہ کے ذہن پہ بہت برا اثر پڑا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کچھ عرصہ تک کسی کو پہچانے ہی نہیں۔" شیر افگن نے اسے دنیا سے کاٹ کر اچھا نہیں کیا تھا۔ اگر کسی اچھے بھلے امنگوں بھرے انسان کو جنگل میں چھوڑ دیا جائے یا کسی اکیلی جگہ محدود کر دیا جائے تو بہت جلد وہ انسان تہذیب فراموش کر دے گا۔ تنہائی، مایوسی، اندھیرا انسانی ذہن پہ بہت برے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ کال کوٹھڑی میں پڑا پھانسی پانے والا اور ایک اندھیرے کمرے میں قید انسان کے احساسات میں زیادہ فرق نہیں ہوتا پھانسی پانے والا پہلے ہی لحہ بہ لحہ مرتا ہے حقیقی موت کی نوبت تو کہیں بعد میں آتی ہے۔ جب موت کا یقین ہو جائے تو پھر انسان پر سکون ہو جاتا ہے۔ موی کو امید ہی نہیں ہو گی کہ وہ دنیا دوبارہ بھی دیکھ سکے گی۔ ابراز کے مطابق وہ خوراک کی کمی کا بھی شکار تھی۔ شدید خوف محرومی اور احساس تنہائی نے پہلے ہی اس کی ساری توانائی چوس لی تھی۔

ثناء رات بہر حال میں اس کے پاس رکنا چاہتی تھی، اس لیے وہ کپڑے تبدیل کرنے گھر آئی تھی۔ مومنہ کی حالت دیکھ کر اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ شیر افگن جیسے شقی القلب آدمی کو فوراً سے پیشتر قتل کر دے۔ وہ اس کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی تھی مگر اس وقت سمیر کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھی کیونکہ شیر افگن اچھے ارادوں سے تو نہیں آیا ہو گا۔ ثناء کو دیکھ کر وہ بالکل نہیں چونکا بلکہ بڑے دوستانہ انداز میں خیریت دریافت کی۔

"ہاں! تو سمیر تم قانون کے محافظ ہو مگر تمہیں تو شاید قانون کی الف بے بھی نہیں پتہ ہے۔ اس طرح کسی کے گھر میں چوروں کی طرح گھسنے پر معلوم ہے کونسی دفعہ لگتی ہے۔" بظاہر بے ضرر سے لہجے میں طوفان کرو میں لے رہا تھا۔

"شیر لگتا ہے کہ تمہیں بھی نہیں پتہ کہ کسی کو حبس بے جا میں رکھنے پر کون سی دفعہ لگتی ہے۔" سمیر کا لہجہ پر سکون ہی تھا۔

"سمیر ملک وہ میری بیوی ہے اس کی خواہش پر میں نے شادی کی ہے۔ معلوم ہے تمہیں وہ مجھے چاہتی ہے، محبت کرتی ہے، مجھ سے پاگلوں کی طرح۔ اس وقت سے جب ثناء کے ساتھ میرے پرپوزل کی بات بھی نہیں چلی تھی۔"

"اچھا جواب ہے محبت کرنے والوں کے ساتھ یہی سلوک تو کیا جاتا ہے انہیں اندھیری کوٹھڑی میں رکھا جاتا ہے۔ بھوک پیاس سے

اذیت دی جاتی ہے۔ اچھا صلہ دیا تم نے اس کی چاہت کا۔"

"میں یہاں اخلاقیات کا سبق پڑھنے نہیں آیا ہوں مجھے بتاؤ مومنہ کہاں ہے، کون سے ہاسپٹل لے کر گئے ہو اسے؟" وہ کینہ توز نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

"تمہارا اب اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" سمیر نے شانے جھٹکے تو شیر افگن نے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

ثناء نے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ وہیں پکڑ لیا اور سمیر کے سامنے آگئی۔

"آپ کی زبان پر اب مومنہ کا نام نہیں آنا چاہئے۔ اپنی طرف سے آپ اسے مار ہی چکے تھے پھر اب اسے مردہ تصور کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کاش امی یہاں سے نہ جاتی زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ اس کی جگہ میں ہوتی میں بہت سخت جان ہوں۔ افگن صاحب موی موم کی طرح نازک و نرم ہے۔ آپ کے لیے بہت بڑی نیوز ہے میرے پاس۔ اس خبر سے حاصل ہونے والے فوائد سے آپ کے کندھوں پر پھولوں کا بوجھ بڑھ جائے گا۔ آپ کی افسری کا دائرہ کار بڑھے گا۔ آپ کی فرعونیت کے غرور میں اضافہ ہوگا، اس لیے کہ آپ کے باپ کے قاتل کی بیٹی مومنہ حسن نہیں بلکہ ثناء زبیر ہے۔" اس نے دھماکہ کیا شیر افگن جیسا مضبوط اعصاب کا مالک مرد بھی سناٹے میں آگیا۔

"ثناء آپ اتنا بڑا دعویٰ کس بل بوتے پر کر رہی ہیں؟"

"سمیر آپ انہیں ثبوت دکھایئے۔" وہ روتی ہوئی ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

"یہ کیس انکل سے متعلق ہے ایم شیور کہ تمہارے حوالے ہی کیا جائے گا، اس لیے بہتر ہے کہ انہیں دیکھ لو۔" سمیر نے سرد و سپاٹ انداز میں موٹا خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

"ثناء کی حفاظت کے لیے میں، دو بندے اور گھر کے باہر سول ڈریس میں ایک بندہ صبح ہی چھوڑ دوں گا۔ معاملہ میری توقع سے زیادہ سیریس ہے۔" اب کے شیر افگن کے لہجے میں پہلے والی تیزی نہیں تھی۔

"سمیر مجھے ہاسپٹل چھوڑ آئیں۔" وہ چہرہ دھو کر کپڑے بدل کر آئی تھی۔

"اوکے شیر افگن ہم ہاسپٹل جا رہے ہیں تم کھانا کھا کر جانا۔" شیر افگن کو نگاہیں ملانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

☆☆☆

"میرے بھائی نے ایسا کیا کر دیا ہے؟"

"جاننا چاہتی ہو۔"

"بالکل۔"

"تو پھر آؤ میرے ساتھ تمہیں بھی تو علم ہونا چاہئے تمہارے لائق فائق بھائی جان نے کیا کیا ہے۔" ارباز واش روم میں گھس گیا چند منٹ بعد وہ اسے کلینک لے جا رہا تھا۔ ثناء کو وہاں پا کر پلوشہ کو بیک وقت حیرانی و خوشی نے آگھیرا۔ وہ اشتیاق سے اس کے گلے لگ گئی۔

''بھائی جان نے تمہیں بے قراری سے ہر جگہ تلاش کیا۔ تم کہاں چلی گئی تھیں۔'' اس نے ایک سانس میں پوچھا۔

''آپ کے بھائی کو میرے لیے پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے اور میں بنکاک میں چلی گئی تھی۔'' وہ اجنبی مگر کاٹ دار لہجے میں بولی۔

''بند کر دو یہ روشنی میں کہتی ہوں کہ اندھیرا کر دو۔ روشنی میری آنکھوں میں چبھ رہی ہے۔'' سامنے سفید براق بستر پر پڑے وجود میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے چادر اتار دی۔

''اُف خدایا یہ تو موی ہے۔'' پلوشہ اس کا حال دیکھ کر گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''جی ہاں! یہ موی ہے۔'' ثناء چبا کر بولی اور اس کے بستر کے قریب چلی گئی۔

''اب تمہیں روشنی میں ڈر نہیں لگے گا میں ہوں ناں تمہارے ساتھ شاباش سو جاؤ۔'' ثناء نے بہلا پھسلا کر اس کا سر تکیے پر رکھا اور ارباز کو بلایا جب سے وہ ہوش میں آئی تھی اس کا یہی حال تھا۔

''یہ تو بھاگ گئی تھی۔'' پلوشہ دھیرے سے ارباز کے کان میں بولی جو موی کو انجکشن لگا رہا تھا۔

''یہ کہاں بھاگ گئی تھی اپنے عزت مآب بھائی سے پوچھنا یہ تمہارے گھر کے پیچھے بنے تہ خانے میں بھاگ گئی تھی۔'' ثناء کے لفظ لفظ سے آگ برسنے لگی تھی۔ ارباز دھیرے دھیرے اسے بتانے لگے۔ ''نہیں بھائی ایسا نہیں کر سکتے مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''وہ ایسا کر چکے ہیں۔ نتیجہ تم دیکھ رہی ہو اپنے بھائی سے کہو کہ اب میرے اوپر بھی کوئی چارج لگا دیں۔''

''پلیز ثناء تم تو یوں مت کہو میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔'' پلوشہ کی آنکھیں اور سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے ثناء کے آگے ہاتھ جوڑ دیے ڈبڈبائی آنکھوں سے دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔

''ثناء پتہ نہیں اللہ ہمیں معاف کرے گا یا نہیں ہم نے موی کے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔'' روتے ہوئے وہ بار بار یہی جملہ دُہرا رہی تھی۔

ارباز نے آ کر انہیں الگ کیا۔ ''مجھے اس بچگانہ رویے کی امید نہیں تھی کچھ تو موی کا خیال کرلو اللہ سے اس کی صحت یابی کی دعا مانگو۔''

''ارباز بھائی آج کل میری ساری دعاؤں کا محور موی ہے ہاں مگر میں شیر افگن کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

☆☆☆

ان لوگوں کی مسلسل توجہ سے اب اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ ہوش و شناسائی کی وادی میں لوٹ آئی تھی۔ ارباز نے کہا تھا کہ کوشش کرو اس کے ذہن پہ بوجھ نہ پڑے پھر بھی روز آتا اسے نئے نئے لطیفے سناتا اجڑی اجڑی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آ ہی جاتی۔

☆☆☆

مونٹی کارلو کے جوئے خانوں میں موٹی موٹی رقمیں ہارنے کے بعد جب زبیر بنکاک لوٹا تو ثناء کی پاکستان روانگی نے اسے بھڑکا دیا۔ اٹلی میں تو وہ غلط عورتوں کی بے باک مسکراہٹوں میں اسے بھول بیٹھا تھا یہاں کی صورت حال نے اس کے دماغ کی چولیں ہی ہلا ڈالیں۔ ثناء ریڈ فائل لے کر گئی تھی جس میں اس کے زیرِ زمین اڈوں کی سرگرمیاں کارندوں کے نام و پتے بینک اکاؤنٹس لاکرز نمبر دولت و جائیداد کی تفصیل و ذرائع اور اس طرح کے دوسرے خطرناک راز تھے۔ اگر وہ فائل کسی کے ہاتھ لگ جاتی تو اس کی عبرتناک موت یقینی تھی۔ اس نے فوراً پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے دست راست نے اسے روکا۔ ''وہاں بہت خطرہ ہے۔''

''خطرہ کیسا میں بڑے دھڑلے سے پاکستان میں رہا ہوں۔ کسی کو میرے اوپر شک نہیں ہے۔ پھر وہ میری بیٹی ہے غداری نہیں کر سکتی۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔'' زبیر کے لبوں پہ مکارانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ''معلوم کرو کہ وہ کہاں ہے؟ چوبیس گھنٹے میں پتہ لگ جانا چاہئے کہ وہ کس جگہ ہے۔ اگر اس کا کانٹیکٹ نمبر ملے تو فوراً مجھے بتاؤ۔''

☆☆☆

''ہیلو۔'' اس نے فون اٹھایا۔

''کیسی ہے ہماری بیٹی؟'' وہ زبیر کی آواز فوراً پہچان گئی۔

''ٹھیک ہوں ڈیڈی۔'' اس نے اندرونی نفرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''وہ فائل تمہارے پاس ہی رہے ورنہ مجبوراً مجھے ایک گولی ضائع کرنے پڑے گی۔ میں پرسوں آ رہا ہوں۔ ایئرپورٹ آ جانا میں نے کمرہ میریٹ ہوٹل میں بک کروالیا ہے۔ ڈبل روم ہے جب ایئرپورٹ آؤ تو وہ فائل ساتھ لانا ہم دونوں اکٹھے ہوٹل چلیں گے۔ باپ کی موجودگی میں بیٹی غیروں کے در پر پڑی اچھی نہیں لگتی۔'' کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ثناء ریسیور کریڈل پر ڈال کر ہٹی تو چہرے پہ پسینہ چمک رہا تھا۔

''کیا بات ہے کس کا فون ہے۔'' سمیر اس کی غیر معمولی حرکات وسکنات سے چونک گیا۔

''زبیر کا فون تھا۔'' وہ اسے باقی تفصیل بتانے لگی۔

''میں تھانے جا رہا ہوں شیر کو بتانا ضروری ہے۔'' وہ یونیفارم بدلنے چلا گیا۔

☆☆☆

مسافر کسٹم سے فارغ ہو کر ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آ رہے تھے۔ ثناء گاڑیوں کی قطار سے ذرا ہٹ کر کھڑی تھی۔ ایئرپورٹ کے چاروں طرف پولیس پھیلی ہوئی تھی۔ خود شیر افگن اور سمیر چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ ان کا مطلوبہ شخص آتا دکھائی دیا تو وہ چوکنا ہو گئے۔

''کیسی ہو بیٹی؟'' زبیر نے اسے گلے لگایا۔

پورٹر اس کا سامان لا رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ گاڑی میں بیٹھتا۔ سمیر نے اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا۔ باہر جہاں سول ڈریس میں پولیس کے جوان تھے وہاں زبیر کے آدمی بھی تھے۔ وہ فوراً سنبھلتا ہوا مڑا تو زبیر نے گولی چلادی جو اس کے بازو کے گوشت کو ادھیڑتی نکل گئی۔ سمیر نے دائیں ہاتھ سے زبیر پر فائر کر دیا۔ وہ زمین پر جھومتا ہوا گر پڑا۔ سرخ ہوتا فرش یہ بتا رہا تھا کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ ثناء کے آنسو پلکوں کی سرحد توڑ کر گالوں پہ آ گئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا۔

جس نے زبیر کو پکڑوانے میں مدد کی تھی۔ وہ ایک محب وطن لڑکی تھی اور ابھی جو رو رہی تھی وہ ایک بیٹی تھی۔ برے سے برے باپ کی موت پر بھی بیٹیاں روتی ہیں کیا اسے رونے کا حق حاصل نہیں تھا؟

☆☆☆

''شاہ تم نے جو کام کیا ہے وہ آج تک کسی بیٹی نے نہ کیا ہوگا۔ میں تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا ایسی بیٹی ہر کسی کو دے۔ جب تک تم جیسی لڑکیاں زندہ رہیں گی ہمارا ملک بھی سلامت رہے گا۔'' سمیر بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

''میرے باپ کے جرائم کا بوجھ تھا میرے کندھوں پر جب مجھے خبر ہوئی کہ میرا باپ وطن فروش ہے، قاتل ہے تو اسی روز سے میرا دکھ سوا ہو گیا۔ میرا دل بجھ گیا تھا۔ سب کہتے کہ موی کے مقابلے میں تم اتنی سنجیدہ کیوں ہو تمہاری عمر کی لڑکیاں تو ہشاش بشاش ہوتی ہیں۔ مسکراہٹ ان کے لبوں سے جدا ہی نہیں ہوتی..... جن بیٹیوں کے باپ زبیر جیسے ہوتے ہیں ناں، وہ اندر ہی اندر مر جاتی ہیں۔ انہیں گھن کھائے جاتا ہے۔ ایسی بیٹیوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں ملنا چاہیے۔ انہیں تو ٹھوکروں میں رکھنا چاہیے۔ ایسے باپ، اولاد پیدا کرتے ہی کیوں ہیں جو ذلت و رسوائی ان کے مقدر میں لکھی ہے تو انہیں سانس کیوں لینے دیتے ہیں بتائیں ناں بتائیں ناں۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ پڑی۔

''شاہ آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ تو ملک کے ساتھ مخلص ہیں ناں۔ پھر یہ مایوسی اور آنسو کیوں، سر اٹھا کر چلیں نارمل انسانوں کی طرح رہیں۔ زبیر کے باپ کو آپ یہیں دفن کر دیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اگر میں کہوں کہ اے عظیم لڑکی مجھے قبول کر لے تو آپ کا کیا جواب ہوگا؟''

وہ آج دل کا راز آشکار کر دینا چاہتا تھا۔ حقیقتاً شاہ کی بہادری اور جذبے نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اتنے روز سے وہ اس کے گھر میں رہ رہی تھی بالکل ثومیہ کی طرح گھر کے ہر کام میں حصہ لیتی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ پریشان ہوتی وہ اس کے دل میں گھر کر گئی تھی آپا اور گھر والوں کو بتانے سے پہلے وہ شاہ سے اس کی مرضی پوچھنا چاہتا تھا۔

''مجھ جیسی کم مایہ لڑکی کو اپنے گھر میں پناہ دے کر آپ نے جو احسان کیا ہے میرے لیے وہی بہت ہے مگر میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گی کہ آپ میرے اوپر ترس کھائیں۔''

''تو کیا میں یہ سمجھوں کہ موی کے بارے میں مجھے دھوکہ ہوا ہے۔'' موی کے لیے اس کی اتنی شدید پریشانی دیکھ کر وہ جان گئی تھی کہ یہ سب بے سبب نہیں ہے۔

''ہاں کبھی میں نے اس کے بارے میں سوچا تھا جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں پرائی امانتوں پر نظر رکھنے والا شخص نہیں ہوں۔ ایک انسان ہونے کے ناطے میری پریشانی فطری ہے۔ دوئم مجھے اس لیے بھی دکھ ہے کہ مومنہ معصوم اور بے گناہ ہے۔'' شاہ نے آسودہ سی سانس لی۔

''شاہ، بدگمانی کو دل میں جگہ مت دیجیے گا۔ اس لیے کہ مومنہ ایک سراب تھی اور آپ ایک حقیقت ہیں۔ میں سرابوں کے پیچھے نہیں بھاگا کرتا۔ بڑا عملی بندہ ہوں اب تو آپ کی تسلی ہو گئی ہے ناں۔'' اس نے تائید چاہی۔

☆☆☆

''میری جان شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو گئی ہو۔'' فرط مسرت سے شاہ نے موی کو لپٹا لیا ارباز نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ سمیر اور ثومیہ دونوں کی محبت دیکھ کر آبدیدہ سے ہو گئے۔ شاہ کتنی بے تابی سے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیے پیار کر رہی تھی جس طرح اس نے اس کی تیمار داری کی تھی وہ اس کی معترف ہو گئے تھے۔ کتنی راتیں اس نے جاگ کر موی کے سرہانے گزاری تھیں۔ بے قراری سے دعائیں مانگتے ہوئے پل پل

تڑپی تھی۔ موی نے جب آنکھیں کھولیں تو اس نے کتنے شکرانے کے نوافل پڑھ ڈالے تھے اور آج جب وہ خود اٹھ کھڑی ہوئی تھی تو اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ بار بار اسے چھو کر دیکھتی اس کے ہونے کا یقین کرتی۔ ارباز اور سمیر اس کی بچکانہ بے قراری دیکھ کر ہنسے جا رہے تھے۔

''موی! تم اس تہ خانے میں کیسے پہنچیں؟'' حقیقت تلخ سہی مگر اس سے آگاہی ضروری تھی۔ وہ اس کے سوال پہ ماضی میں پہنچ گئی تھی۔

صرف ایک سال پیچھے جو اس کے وجود پہ اپنی بے رحمی ثابت کر گیا تھا۔ اسے کچھ بھولا تو نہیں تھا۔ پل پل کی داستان یاد تھی۔ شیر افگن کے تھپڑ سے اس کے چہرے پر اس کی انگلیاں اور آدھی ہتھیلی چھپ گئی تھی۔ اسے بہت تکلیف محسوس ہوئی تھی۔

''مجھ سے سچ بولو۔'' اس نے موی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''سچ وہی تھا جو میں نے ابھی کہا ہے۔'' نہ جانے وہ کیوں اتنی بہادری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

شیر افگن نے اس کے شانے پر پوری قوت سے دباؤ ڈالا اس کی فولادی انگلیاں میخ کی طرح نرم گوشت میں دھنس گئیں۔

''چھوڑیں مجھے۔'' اسے بے پناہ تکلیف محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی اس نے اس کے ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹانے چاہے۔

''مجھے بھی تمہیں پکڑنے کا شوق نہیں ہے۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔'' اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ گیراج کی طرف لے آیا۔ وہ حیران تھی کہ آخر وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ پھر اس نے تہ خانے کا دروازہ کھول کر اسے بھی اندر گھسیٹ لیا۔ اب اسے کچھ کچھ ڈر سا لگنے لگا تھا۔ اس نے موم بتی جلائی تو تاریکی قدرے کم ہوگئی۔

''پھر وہ مجھے وہاں چھوڑ کر نکل آئے میں بہت چیخی روئی چلائی واسطے دیے التجائیں کیں مگر دروازہ نہیں کھلا وقت کا احساس ہی میرے نزدیک ختم ہوگیا تھا۔ میں نے خوف کی اتنی صورتیں دیکھیں کہ مجھے خوف کے معنی ہی بھول گئے۔ وہاں خوراک بند ڈبوں کی صورت میں تھی اور پانی نلکے سے آتا روشنی کے لیے موم بتی تھی۔ میں نے خود کو زمانہ قدیم کا کردار محسوس کیا۔ میں نے ایک سال تک کسی انسان کی صورت نہیں دیکھی، نہ آواز سنی مجھے یقین تھا کہ میں گھٹ گھٹ کر اسی قبر میں مر جاؤں گی اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ ایک لڑکی مومنہ حسن بھی ہوتی تھی، ثناء کیا سب کو محبت کرنے کی اتنی کڑی سزا ملتی ہے۔'' وہ روتے روتے معصومیت سے بولی تو اس نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''پتہ نہیں، میں نے کونسی نیکی کی تھی جو تم دوبارہ مل گئی ہو۔'' ثناء نے اس کا ماتھا چوما ''تم اور سمیر بھائی کوششیں نہ کرتے تو اس وقت میں نے اللہ میاں کے پاس ہونا تھا۔''

''خبردار! ایسی باتیں نہیں کرتے۔'' ثناء نے خفگی سے اسے ٹوکا اور اسے ہولے ہولے ننھے بچے کی طرح تھپکنے لگی۔

☆☆☆

''موی چند روز میں میری شادی ہونے والی ہے۔''

''ہائیں کب کس کے ساتھ کب ہوا یہ حادثہ۔'' جوش سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''مجھے کسی نے بتانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اتنی ہی فالتو ہوں ناں۔'' وہ سیکنڈوں میں ناراض ہوگئی۔ اشتیاق و ناراضگی کی ملی جلی کیفیت میں ثناء کو وہ بڑی معصوم لگی۔

"ناراض مت ہونا اب کسی کی بھی ناراضگی میرے اندر برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ بات زیادہ پرانی نہیں۔ سمیر نے مجھے پرپوز کیا ہے۔"

"وٹس گریٹ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

ثناء اور موی نے ایک بنگلہ کرائے پر لے لیا تھا اب وہ وہیں رہائش پذیر تھیں۔ سمیر کے والدین گاؤں سے ڈائریکٹ ادھر ہی پہنچے تھے۔ سمیر نے کہا تھا کہ وہ جہیز کے نام پر ایک روپیہ تک نہیں لے گا اس کے گھر اور زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ وہ اپنے زور بازو پہ بھروسہ رکھتا ہے۔ ان لڑکوں میں سے نہیں ہے جو اپنی بیویوں کے لائے ہوئے مال پر نظر رکھتے ہیں۔" سمیر کے ماں، باپ بھی قانع اور سادہ زندگی گزارنے والے صاف گو لوگ تھے۔ انہیں بیٹے کی باتوں سے پورا اتفاق تھا۔

موی نے ثناء سے کہا کہ "ایک بہترین لڑکا تمہارا شریک سفر بن رہا ہے۔ اس کی قدر کرنا ایسے ہیرے جیسے کھرے لوگ کم کم ہی ملتے ہیں۔"

☆☆☆

بیک وقت موی اور سمیر کی طرف سے دعوتی کارڈ ملا تھا۔ بلاشبہ حیران تھی اس سے پہلے کہ وہ الجھتی سمیر مٹھائی لے کر خود ہی چلا آیا۔ "شیر گھر میں نہیں ہے تین بار جا چکا ہوں مگر موصوف غائب ہوتے ہیں۔" اس نے اس کے بارے میں پوچھا۔

"پتہ نہیں میں تو ہفتے بھر سے گئی ہی نہیں گھر کے بکھیڑے ہی ختم ہونے میں نہیں آتے۔"

"اچھا ایک کارڈ اسے بھی دے دیجئے گا۔ میں خود بھی آؤں گا فی الحال تو مصروف ہوں ابا جان نے گاؤں بلوایا ہے اب میں چلتا ہوں۔" وہ اجازت لے کر چلا آیا۔

تھانے سے نکلنے کے بعد شیر یونہی گاڑی دوڑا رہا تھا۔ آج کل وہ بہت اپ سیٹ تھا۔ لگتا تھا ہر شخص اسے شرمندہ کرنے کی کوششوں میں ہے۔ وہ خواہش کے باوجود موی کو دیکھنے نہیں جا سکا تھا۔ اس کا سبب اس کا رویہ تھا جو لاعلمی کے باعث اس نے اپنایا تھا۔ دھند چھٹ جانے کے بعد وہ بے حد اپنی لگنے لگی تھی۔ موی کے پلس پوائنٹ ایک ایک کر کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ سب سے معذرت کرنے کے لیے حوصلے جمع کر رہا تھا مگر سب سے بڑی رکاوٹ جو راہ میں حائل تھی وہ اس کی ضدی، خودسر، منہ زور انا تھی جو اس کے ہاتھ پیر باندھے ہوئے تھی۔

سمیر کی مہندی لے جانے کے لیے مومنہ کے گھر ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ سب نے سمیر کے گاؤں جانا تھا جو اڑھائی تین گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ثناء اور مومنہ کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ مہندی اور موم بتیوں کے تھال لیے لڑکیاں بسوں، گاڑیوں میں سوار ہو رہی تھیں۔ پھر بیٹھتے ہی گانوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ غزلوں اور انگلش گانوں تک کو نہیں بخشا گیا تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد کچی سڑک شروع ہو گئی۔ اردگرد گھنے درخت، جھاڑیاں اور کھیتوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے جو رات کے اندھیرے میں بڑے انوکھے لگ رہے تھے۔ سمیر کے گھر والوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا اور بھنے مرغ سے ان کی تواضع کی ساتھ تندوری روٹی نے بہت مزا دیا کھا پی کر لڑکیاں، لڑکے مقابلے پر اتر آئے۔ سمیر کی کزنز ان لوگوں سے ذرہ بھی مرعوب نہیں ہوئیں۔ وہ کہیں سے بھی پینڈو نہیں لگ رہے تھے۔ کہیں بھی ان سے ہار نہیں مانی وہ سب اپنے غلط اندازوں پر بڑا شرمندہ ہوئے۔ سمیر کی بھابھیاں اور رشتے کی بہنیں تلے سے بھرے آنچل کی چھاؤں میں اسے مہندی کی چوکی پر لائیں ساتھ اس کے دوستوں کے لیے بھی

کرسیاں رکھی گئیں۔

''موی مہندی لگانے کا پچاس ہزار سے کم نہ لینا بڑا پیسہ ہوتا ہے ان لوگوں کے پاس۔'' اس کی دوست اس کے کان میں گھسی بول رہی تھی۔ سمیر کے کزن چلا رہے تھے۔

''سمیر بھائی ان لڑکیوں کو پانچ پانچ روپے سے کم نہیں دینا ہے بڑی لالچی لگ رہی ہیں۔ دیکھیں سرگوشیاں کر رہی ہیں یقیناً آپ کی جیب پر شریفانہ ڈاکہ مارنے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔'' دوسری طرف سے وقار اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا اور لڑکیوں کی سرگرمیوں کا آنکھوں دیکھا حال بھی نشر کر رہا تھا۔ بالآخر موی لڑکیوں کے جلو میں سمیر کے لیے سجائی گئی چوکی کی طرف بڑھی۔

''سٹائل تو دیکھو جیسے دنیا فتح کرنے نکلی ہیں۔'' سمیر کے کزن ساجد نے لقمہ دیا تو موی نے پلٹ کر کرارا سا جواب دیا اور اس سمیت سب کی بولتی بند کر دی۔

''سمیر بھائی آگے کریں ہاتھ۔'' وہ رنگ برنگی بولیوں کے شور میں چوتھی بار بلند آواز میں بولی مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا اوپر سے سمیر کے کزنز نے آفت مچائی ہوئی تھی۔ سمیر کو ہاتھ آگے کرنے ہی نہیں دیتے۔ ''یہ دنیا کی مہنگی ترین مہندی آپ لگوا رہے ہیں یہ محترمہ مہندی لگاتے ہی ہزاروں کا مطالبہ کریں گی جائیں ہم نے نہیں لگوانی وکی اندر سے کون تولا۔'' ساجد اس سے مخاطب ہو کر اندر کی طرف ہانک لگانے لگا جانے کہاں سے مہندی کا ایک گولا اڑتا ہوا آیا اور ساجد صاحب کا سوٹ رنگین کر گیا۔ یہ شرارت ازما کی تھی جواب معصوم سی شکل بنائی ہوئی تھی۔ ''جیو کون مہندی مانگی تھی یہ نہیں کہا تھا کہ پوری پرات ہی دے دو۔'' وہ اپنے نئے سوٹ کا حشر دیکھ کر غش کھا رہا تھا۔

موی موقع غنیمت جان کر کسی نہ کسی طرح سمیر کے قریب پہنچ ہی گئی۔ وہ گرد و پیش سے یکسر بے خبر مہندی لگانے کی ٹرک پر غور کر رہی تھی کیونکہ اس نے نوٹ کیا تھا کہ سمیر ان لڑکوں کے ساتھ ہے اس کی جرأت کا مزہ چکھانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ سب اس کے ساتھ تھے۔ موی نے سکے برابر مہندی سمیر کی ہتھیلی پر رکھی اور پھر پیچھے سے اشارہ پاتے ہی تھال سے مٹھی بھر کے گیلی مہندی اٹھائی جس کا رخ سمیر کے چہرے کی طرف تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوتی اس کا ہاتھ فضا میں ہی روک لیا گیا۔

''یہ بے ایمانی نہیں چلے گی۔'' یہ آواز یہ لہجہ وہ لاکھوں میں بھی شناخت کر سکتی تھی۔ شیر افگن سمیر کے برابر بیٹھا اپنے جان لیوا انداز میں مسکرا رہا تھا۔ موی کے ہاتھ سے مہندی گر گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمکین پانی کا سمندر جمع ہو چلا تھا۔ بھیڑ کو چیرتی، عورتوں سے الجھتی وہ وہاں سے بھاگ کر آ گئی۔

''یہ ابھی تک کھلا پھر رہا ہے۔'' وہ طویل دالان سے گزر کر گھنے درختوں کے نیچے آ گئی جہاں اب اسے کوئی آسانی سے ڈھونڈ نہیں سکتا تھا۔ ادھر اس کی گمشدگی سے ہلچل مچ گئی تھی۔ ''ارے موی کہاں چلی گئی ٹیگ بھی نہیں لیا ڈھونڈو اسے۔'' طرح طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شیر افگن بھی چپکے سے نکل آیا اس کی آنکھوں میں چمکتے ستارے وہ دیکھ چکا تھا۔ چوڑیوں کی ہلکی ہلکی گنگناہٹ اسے پاس کے درختوں میں محسوس ہوئی۔ موی رو رہی تھی۔ بار بار دوپٹے سے آنکھیں رگڑتی تو چوڑیاں جلترنگ سا بجاتیں اسی آواز نے شیر افگن کی رہنمائی کی وہ دبے قدموں اس کی پشت پہ پہنچا۔

''وہاں سے بھاگ کیوں آئیں میں تمہیں کھا تو نہیں جاتا۔'' وہ لہجے میں غصہ بھر کے بولا تو وہ اچھل پڑی۔

''کیوں آئے ہیں میرے پیچھے آپ، مر چکی ہوں میں آپ کے لیے اگر ہو سکے تو مومنہ حسن کی روح کو تہ خانے میں تلاش کریں۔'' اس کا کرب آنسو بھری آواز میں سمٹ آیا تھا۔

''تمہاری روح کو نہیں تمہیں تلاش کروں گا وہاں، بھاگی کیوں وہاں سے، جن لوگوں نے تمہاری مدد کی ہے میں انہیں دیکھ لوں گا یہ مت سمجھنا کہ تمہیں اس پنجرے سے رہائی مل گئی ہے۔ لے جاؤں گا تمہیں دوبارہ، اب کی بار ایسا پکا کام کروں گا کہ تمہیں نکلنے کی جرأت نہیں ہوگی۔'' موی سن ہو گئی ایک دم اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا اترا۔ اس نے حواسوں کو بیدار رکھا اور دوڑ لگا دی وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھس گئی دل خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔

گھر واپس آ کر اس نے مہندی کے ہنگامے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی اور سو گئی۔ رات بھر وہ ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی۔ بعد میں وہ سمیر کے ولیمے پر بھی نہیں گئی اسے یقین ہو گیا تھا کہ شیر افگن اسے کسی نہ کسی طرح اٹھوا لے گا۔

☆☆☆

''موی ایک بار بھی اس نے معذرت نہیں کی نہ تمہیں دیکھنے ہاسپٹل آیا۔ اسے تمہارا کوئی خیال نہیں ہے اتنا خوش ہوگا کہ جان چھوٹ رہی ہے۔ تم بھی لعنت بھیجو اس پر۔ اب تو اس پر دو کیس دائر ہوں گے۔ ایک تمہیں حبس بے جا میں رکھنے کا اور دوسرا طلاق کا۔'' موی لرز گئی۔

''کل وکیل صاحب سائن کروانے آئیں گے۔ انہیں سمیر کے ابو نے بلایا ہے۔ ڈرنا مت کچھ نہیں ہوگا ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔'' ثناء اسے تسلی دے رہی تھی۔ طلاق کا سن کر موی کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ عدالت اسے موی کو حبس بے جا میں رکھنے پر اندر کر دے گی۔ نوکری سے اسے جواب ملے گا وہ ہتھکڑی پہنے جھکے سر کے ساتھ اسے دیکھ سکے گی۔ پھر عدالت کے ذریعے اسے طلاق مل جائے گی۔ یہ لوگ اس کی شادی کسی اور سے کر دیں گے۔ تو کیا وہ برداشت کر سکے گی۔

وہ کسی کو بھی شیر افگن جیسی اہمیت وحیثیت نہیں دے سکتی تھی کاش! کہ وہ سب کو بتا سکتی۔

سمیر کی نائٹ ڈیوٹی تھی ثناء نے مومنہ کو بلایا تھا۔ شادی کے ایک ہفتے بعد سمیر ثناء کو لے کر گاؤں سے آ گیا تھا۔ آپا واپس گاؤں چلی گئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اب سمیر کا خیال رکھنے والی آ گئی ہے۔ وہی اس کے ناز اٹھائے ہم نے بہت دن گاؤں سے دور رہ لیے مزید دوری گوارا نہیں ہے اور واقعی ایسا ہی تھا وہ تو بھائی کے کھانے پینے کے خیال سے شہر آ گئی تھیں۔ اب یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا انہیں اپنی موجودگی بیکار ہی لگی سو وہ سدھار گئیں۔

''ثناء خوش ہو۔'' موی نے قصداً اپنا ذہن ادھر اُدھر کیا۔

''بہت زیادہ۔'' وہ بے جھجک بولی پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔

''صبح وکیل صاحب کی طرف چلنا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ نو بجے تک تمہیں لے آؤں زیدی صاحب آ چکے ہوں گے۔''

''شیر افگن نے تمہارے اوپر کوئی تشدد وغیرہ تو نہیں کیا کبھی؟'' ثناء اطمینان سے بیڈ پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی۔ اس کے اسٹائل سے لگ رہا تھا کہ وہ اسے چھوڑے گی نہیں۔

''نہیں۔''

''تو وہ تھپڑ کیسا تھا جو اس نے تمہیں مارا تھا۔'' ثناء چمک کر بولی۔

''ایک تھپڑ بھی کبھی تشدد ہوتا ہے ہزاروں لاکھوں بیویوں کو شوہر بے دردی سے مارتے ہیں مگر وہ تو عدالتوں میں نہیں جاتیں انہوں نے ایک تھپڑ مار کر کیا ظلم کیا ہے میرے اوپر۔'' وہ جھلا گئی ثناء نے اس کی بدلتی کیفیت بغور نوٹ کی۔

''اچھا کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تم دونوں کے درمیان۔'' اب موی بچی نہیں تھی جو اس ''ایسی ویسی بات'' کا مطلب ہی نہیں سمجھتی۔ ''ثناء کیسے بیہودہ سوال کر رہی ہو تم؟'' اس کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔

''اور عدالت میں اس کا وکیل جب اس سے بھی زیادہ بے ہودہ سوال کرے گا تو اسے کیسے فیس کرو گی میں تمہارے بھلے کے لیے ہی پوچھ رہی ہوں۔ فرض کرتے ہیں اگر ایسا کچھ نہیں ہوا ہے تو یہ بات ہمارے فائدے میں جاتی ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملزم مؤکلہ کے ازدواجی حقوق ادا کرتا ہی نہیں تھا یا اس قابل ہی نہ تھا۔ اس بات کو ہم ایک نئے رخ سے بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ملزم اس لیے ایسا نہیں کرتا کہ اسے مؤکلہ سے محبت ہی نہیں تھی وہ تو محض اسے اتفاقاً بیاہ لایا تھا۔'' ثناء کی باتوں پر اس کا دماغ گھوم گیا۔ ''یہ بہت اسٹرونگ پوائنٹ ہے بلکہ پلس پوائنٹ بھی اسی بیس پر تمہیں آرام سے آزادی مل سکتی ہے۔'' ثناء وکیلوں کی طرح بول رہی تھی۔ موی نے چہرہ دیوار کی طرف کر لیا۔ اُف اتنی شرمناک باتیں جنہیں ثناء پلس پوائنٹ کہہ رہی تھی۔ وہ ابھی سے شرما گئی تھی۔ بھری عدالت کے بیچ اس کا کیا حشر ہوتا اس سے بہتر ہے کہ وہ کیس دائر کرے ہی نہیں اور ساری زندگی ایسے ہی گزار دے۔ اس بدنامی اور رسوائی سے تو بچ جائے گی۔

☆☆☆

گل بادشاہ نے مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر شیر افگن کو خبر کی وہ اسٹڈی روم میں تھا اٹھ کر اس کے ساتھ ہولیا۔ زیدی صاحب کو دیکھ کر اسے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ بار ایسوسی ایشن کے نائب صدر بھی رہ چکے تھے۔ دیوانی مقدمات لڑنے میں بھی بڑی صاف ستھری شہرت رکھتے تھے۔

''بیٹھیے زیدی صاحب کیسے آنا ہوا۔'' اس نے خود کو کمپوز کر کے انہیں بیٹھنے کا کہا۔

''شیر افگن صاحب میں بیٹھنے نہیں آیا ہوں آپ سے دو ٹوک بات کرنے آیا ہوں۔''

''جی مجھے معلوم ہو چکا ہے آگے بولئے۔'' شیر افگن نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید تفصیلات بتانے سے روکا۔

''مجھے مومنہ حسن کا وکیل مقرر کیا گیا ہے میں ان کی طرف سے دو مقدمات اکٹھے لڑوں گا۔ ایک آپ کی طرف سے انہیں حبس بے جا میں رکھنے کا دوسرا.... طلاق کا کل پرسوں تک لیگل نوٹس آپ کو مل جائے گا۔'' شیر افگن نے دماغ میں آگ بھرتی محسوس کی۔

''اس بیوقوف سی لڑکی کو کس نے یہ ہمت دلائی ہے لوات از امپاسبل وہ ایسا نہیں کر سکتی قیامت تک نہیں۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ یقین تھا۔

''جب ان کی طرف سے آپ کو لیگل نوٹس ملے گا تو پھر آپ کو یقین آجائے گا۔ زیدی نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا پھر اس نے پینترا بدلا۔'' افگن صاحب! بات آپس میں ہی طے کر لیتے ہیں آپ اتنے بڑے آفیسر ہیں۔ آپ کا نام ہے جب کورٹ میں آپ کا نام اچھالا جائے گا تو آپ برداشت کر سکیں گے؟ اس حبس بے جا کی غیر معمولی حرکت پر آپ کی نوکری اور عزت بھی جا سکتی ہے۔ کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر بات ختم ہو سکتی ہے۔ یعنی آپ مومنہ حسن کو یہاں ہی طلاق دے دیں تو ہم بھی بات یہیں ختم کر دیں گے وینس آل۔''

شیر افگن نے بڑی مشکل سے خود کو روکا ورنہ اس کا دل یہی چاہ رہا تھا کہ مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دے۔

''بڑے شوق سے مقدمہ دائر کریں ہاں اچھی طرح سن لیں کہ ایک مقدمہ میری طرف سے بھی ہوگا اپنی قانونی و جائز منکوحہ کو اغوا کرنے اور شوہر کے خلاف بھڑ کانے کا۔'' شیر افگن نے طنزیہ نگاہوں سے زیدی کو گھورا۔

''آپ کے اس بودے مقدمے کی پہلی پیشی پر ہی پرخچے اڑ جائیں گے۔ جب مومنہ حسن بیان دینے آئیں گی۔'' زیدی نے اس کا وار لوٹایا۔

''میں ایک بار مومنہ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''یہ تو ناممکن ہے مومنہ حسن آپ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتیں وہ آپ سے سخت خوفزدہ ہیں۔''

''زیدی صاحب آپ بار بار مومنہ حسن کہہ کر میری توہین کر رہے ہیں درستگی کر لیجیے مومنہ شیر افگن اور وہ مجھ سے ملنے سے کیوں خوفزدہ ہے مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''شیر افگن صاحب آپ منہ کی کھائے بغیر باز نہیں آئیں گے ایسا کریں کل نو بجے آپ یمیر کے گھر پہنچ جائیں ہم آپ کو دوسرے کمرے میں بٹھائیں گے مومنہ کے خیالات سن کر بھی اگر آپ بضد رہے تو آپ کی مرضی ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بہر حال میں چلتا ہوں کل کے لیے ضروری کارروائی کرنی ہے۔ ہاں! آپ کا ارادہ بدل جائے تو مجھے نو بجے سے پہلے فون کر لیجئے گا۔'' زیدی نے ایک کارڈ اس کے سامنے ٹیبل پر رکھا اور طنزیہ مسکراتے ہوئے دروازے سے نکلا۔

شیر افگن نے سر ہاتھوں میں گرا لیا گل بادشاہ کے احساس دلانے پر وہ چونکا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے وہ تین گھنٹے سے اسی پوزیشن میں

تھا جس میں زیدی چھوڑ کر گیا تھا۔ گل بادشاہ کو دروازے لاک کرنے کا کہہ کر وہ بیڈ روم میں چلا آیا۔

کئی بار اس بیڈ پر لیٹے لیٹے اسے حنائی ہتھیلیوں کی خوشبو اور لباس کی سرسراہٹیں محسوس ہوئی تھیں۔ گھٹی گھٹی سسکیوں نے کئی بار اسے بے چین کیا تھا۔ اسے بند کرنے کے بعد دل و دماغ نے کتنی ملامت کی تھی اسے بے ضمیر اور بے حس کہا تھا۔ اس نے دل کا گلا گھونٹ دیا تھا دماغ نے کتنی بار کہا تھا۔ ''باپ کے کیے کی سزا اسے کیوں دے رہے ہو اس کا جرم اتنا ہے کہ اس کی آنکھیں اور پیشانی جلیل کی طرح ہے اس نے تو کچھ نہیں کیا ہے وہ بے گناہ ہے اسے یوں مت مارو۔'' وہ دماغ کو بھی تھپک تھپک کر سلا دیتا اور ابھی کچھ عرصے پہلے جب بات کھلی تو تو اس نے خود کو دنیا کا حقیر ترین انسان قرار دیا تھا۔ باپ کی بے وقت موت نے اسے قبل از وقت ہی بردبار بنا دیا تھا۔ اس نے صنف نازک کے حوالے سے کوئی خواب وغیرہ نہیں پالا اسے معلوم تھا کہ خاندان اور دیگر ملنے جلنے والی لڑکیاں اسے بڑا سراہتی ہیں اسے پرسنالٹی کے حوالے سے آئیڈیل ترین قرار دیتی ہیں۔ پھر گھر والوں نے اس کی لاپروائی و بے نیازی سے تنگ آ کر شاہ سے اس کی بات چلانی شروع کر دی۔ تب بھی اس کے ساتھ کے حوالے سے اس کے دل میں کوئی پھول نہیں کھلا۔ ہاں! مومنہ کی پسندیدگی بھانپ کر اسے عجیب سا احساس ہوا تھا جسے وہ کوئی نام دینے سے قاصر رہا تھا۔ شاہ کی گمشدگی سے اسے کوئی خاص دکھ نہیں ہوا۔ وہ اس کے ساتھ احساسات کی ڈور سے بندھا جو نہیں تھا تعلق ہی رہا پھر موی اس کی زندگی میں آ گئی جس کی آنکھیں دیکھ کر اسے جلیل یاد آتا تھا۔ ان چند ماہ میں بار ہا اس نے خود سے اپنے نامناسب رویے کا اقرار کیا تھا۔ وہ ایک تھپڑ کھا کر ہی سہم گئی تھی۔ شیر افگن اسے ہٹ دھرم اور ضدی لڑکی سمجھتا تھا احمق ہی تو تھی اس سے دل لگایا تھا جو ان جذبوں سے کوسوں دور تھا۔

پلوشہ اور باز نے اس کی حالت کا بہت بھیانک نقشہ کھینچا تھا۔ پلوشہ اپنے سلوک پر شرمندہ تھی چاہتی تھی کہ وہ بھی معذرت کر کے موی کو گھر لے آئے۔ سمیر نے منتیں کر کے اپنی مہندی پر اسے بلایا تھا تو وہاں اسے دکھائی دی ہنستی مسکراتی شرارتیں کرتی یوں لگ رہا تھا وہ بھیانک وقت اس کی زندگی میں آہٹ چھوڑے بنا گزرا تھا۔ تب اسے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ اس کا بندھن بہت مضبوط ہے۔ کبھی نہ ٹوٹنے والا وہ بہت اچھی لگ رہی تھی یوں سجے بنے دیکھ کر بہت سارے جوانوں کی نظریں اس پر ٹھہری تھیں۔ شیر افگن سمیر کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اسے موی کی لاپروائی بہت کھلی وہ اس کے وجود سے یکسر انجان تھی۔ اپنی کلائی پکڑے جانے پر پہلے اسے حیرت اور پھر آنسوؤں نے گھیرا تھا۔ وہ بھاگ گئی تھی جیسے یہ سب اس کی برداشت سے زیادہ ہو وہ بھی اپنے مزاج کے ہاتھوں مجبور تھا۔ لطیف جذبوں کو دھمکی کا پیراہن پہنا کر پیش کیا جس سے وہ ہرنی کی مانند خوفزدہ ہوئی اسے درختوں کے پیچھے روتے دیکھ کر اس نے پھر خود پر نفرین کی تھی۔ اس نے اس لڑکی کو آنسوؤں کے سوا دیا ہی کیا تھا۔ بالآخر اس نے جھکنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ سمیر کو ساتھ لے کر اس روٹھی موی کو پورے مان و چاہت کے ساتھ لائے گا۔ اس فیصلے پہ عمل درآمد کرنے سے پہلے ہی زیدی صاحب چلے آئے۔

''کتنی مکار ہو تم تمہاری وہ چاہت کہاں گئی جو میں نے بار ہا تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے محسوس کی تھی۔ بس ایک امتحان سے ہی گھبرا گئیں۔ شیر افگن کے ساتھ محبت امتحان کا دوسرا نام ہے خیر تم سے ملنے کے بعد دیکھوں گا کہاں غلطی ہوئی یہ تو طے ہے کہ میں تمہیں چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ یہ سہانے خواب کسی اور وقت پر اٹھا رکھو۔'' شیر افگن نے تکیے کو دوہرا کر دیا اسے کسی پہلو قرار نہیں تھا۔

☆☆☆

''موی ڈٹ کر ناشتہ کرو مقابلہ کا وقت آ پہنچا ہے۔'' سمیر نے اسے یونہی سلائس دانتوں سے کترتے دیکھ کر کہا اور خود چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔ وہ کرسی دھکیل کر اٹھ گئی یہ کہتے ہوئے کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔

''بیگم صاحبہ مجھے تو بہت بھوک لگی ہے۔ ذرا میری آنکھوں کے سامنے ہی رہیں۔'' سمیر نے کچن سے گرم گرم پراٹھے لاتی ثناء کا آنچل پکڑا۔ ثناء نے قہر آلود نگاہوں سے اسے گھورا۔

''ہوش کریں موی ادھر ہی ہے۔''

''اسے کیا پتہ بچی ہے۔'' وہ مزے سے بولا تو باہر کھڑی موی کا دل جل کر سیاہ ہو گیا۔

''ہاں بچی ہی تو ہوں جبھی سب مجھ سے کھیل رہے ہیں۔'' اس نے آنسو چھپانے کے لیے باتھ روم کا رخ کیا۔

''مومنہ سے کہو تیار ہو جائے۔'' اب اس کا چہرہ بے انتہا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ثناء نے واش روم کا دروازہ بجایا۔

''موی جلدی کرو۔'' اس نے ہانک لگائی۔

''سمیر میں بھی چلوں گی۔'' وہ غائب دماغی سے سر ہلا کر رہ گیا۔

موی سوجی آنکھوں کو دبائی بالوں میں برش کیے بغیر ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔

''یہ کیا حلیہ بنایا ہوا ہے وکیل کے سامنے تمہیں پر اعتماد نظر آنا چاہیے۔'' اس نے ٹوکا۔

موی نوٹس لیے بغیر گاڑی میں بیٹھ گئی اس کی کائنات لٹ رہی تھی اور کسی کو ہوش ہی نہیں تھا۔

آشیاں لٹ گیا گلستاں جل گیا
ہم قفس سے نکل کے کدھر جائیں گے
اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے
اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

اس کے ہر موئے تن سے یہی صدا آ رہی تھی۔

☆☆☆

''آؤ بیٹا! زیدی کب سے انتظار کر رہا ہے۔'' احمد کمال (سمیر کے ابا) اسے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ ساتھ سمیر اور ثناء بھی تھے۔

''ہاں! بیٹا بتائیں یہ شیر افگن کتنے عرصے آپ پر تشدد کرتا رہا۔'' انہوں نے زیرک نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکائیں۔

''انہوں نے میرے اوپر کوئی تشدد نہیں کیا۔'' اس کے جواب پر سب کو سانپ سونگھ گیا۔

''مومنہ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا زیدی کو سچ سچ بتاؤ۔'' ثناء نے اس کا شانہ تھپکا اس کا حوصلہ بڑھایا

دو تین بار پوچھنے پر وہ خاموش رہی تو زیدی نے دوسرا سوال کیا۔

''انہوں نے کتنا عرصہ آپ کو تہ خانے میں رکھا۔''

''ایک سال۔''

''کیا ان کے اور عورتوں سے روابط تھے یا لڑکیوں کے فون ان کے لیے آتے تھے۔''

''جی نہیں! وہ ایسے نہیں تھے وہ تو لڑکیوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ مجھے بھی شادی کے بعد انہوں نے کوئی بات کہنے کے بجائے تھپڑ مارا تھا۔'' مومنہ بے دھیانی میں تھی تھپڑ والی بات اس کے منہ سے نکل گئی۔

''اس سے اندازہ ہوا کہ مسٹر شیر افگن ان پر جسمانی و روحانی تشدد کرتے رہے ہیں۔ انہوں خود اقرار کیا ہے۔''

مومنہ کو اب تردید کی ہمت نہیں پڑی۔

''بیٹا سب سچ سچ بتاؤ تا کہ ہم عدالت میں اپنی بات سچ ثابت کر سکیں۔'' زیدی نے کہا تو مومنہ کی آنکھیں برسنے لگیں۔

''مومنہ مسٹر افگن نے سمیر ملک کی مہندی کے روز آپ کو کیا دھمکی دی تھی۔''

''انہوں نے کہا تھا کہ اب کی بار میں ایسا پکا کام کروں گا کہ تمہیں بھاگنے کی ہمت نہیں ہوگی۔''

''بات صاف ہے مسٹر افگن مومنہ کو دوبارہ اس عقوبت خانے میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ مومنہ آپ وکالت نامے پر سائن کر دیں۔'' زیدی نے سامنے پڑے بریف کیس سے کاغذ نکال کر ٹیبل پہ اس کے سامنے رکھا اور پین زبردستی اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ مومنہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

''نن نہیں۔'' وہ پین تھامے تھامے کھڑی ہوگئی۔ اس لمحے ملحقہ دروازے سے تیز آتا ہوا شیر افگن نکلا اور کسی کے سوچنے سمجھنے سے پیشتر ہی لگا تار تین چار تھپڑ مومنہ کے منہ پر مارے۔ وہ صوفے پر جا پڑی۔

''اب وکالت نامے پر سائن کرنے میں کیا تکلیف ہے یو ایڈیٹ گرل۔'' وہ دوبارہ خشونت سے مومنہ کی طرف بڑھا تو سمیر نے پکڑ لیا۔

''افگن یہ کیا جنگلی پن ہے۔''

''میں جو کر رہا ہوں ٹھیک کر رہا ہوں تم لوگ اسے مجھ سے چھیننے کی دور کرنے کی سازشیں کر رہے ہو اور اسے ذرا عقل نہیں ہے نان سینس لڑکی۔''

زیدی منہ کھولے بیٹھے رہ گئے۔ ''مجھے تو یہ اور ہی چکر لگتا ہے۔ مومنہ اس سے آزادی نہیں چاہتی اور نہ یہ اسے آزادی دینا چاہتا ہے۔ بات صاف ہے دونوں ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے، ہمیں خواہ مخواہ یہ ظلم نہیں کرنا چاہئے۔'' زیدی سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔

''آپ لوگ مومنہ کو اس کے ساتھ بھیج دیں یہی بہترین فیصلہ ہے۔'' زیدی اٹھ کھڑے ہوئے ان کا کام ختم ہو چکا تھا۔ مومنہ کو ثناء پہلے ہی لے گئی تھی سمیر اور شیر افگن فیصلے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''کیا گھامڑ آدمی ہے یہ زیدی بھی بیٹیوں کو کبھی ایسے بھی رخصت کیا جاتا ہے۔'' وہ بڑبڑائے اور شیر افگن کی طرف رخ کیا۔

''برخوردار تمہیں مومنہ سے محبت ہے۔'' ایک بزرگ کی زبان سے یہ سوال سن کر شیر افگن جھینپا۔

''جی ہاں!'' اسے اقرار کرنا پڑا۔

"تبھی تم نے اسے میرے سامنے مارا ہے تمہاری محبت کا یہ عالم ہے تو نفرت کا کیا ہوگا۔" انہوں نے طنز کیا تو وہ پانی پانی ہو گیا۔

"ایم سوری سر آئندہ یہ نہیں ہوگا۔" وہ واقعی بہت شرمندہ لگ رہا تھا۔

"سر کے بچے میں مومنہ کے باپ کی جگہ ہوں تم بھی چاہو تو مجھے ابو کہہ سکتے ہو۔" انہوں نے تمام کس بل نکالنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

سمیر اس کی شامت اعمال پہ مسکرائے جا رہا تھا۔ سچ ہے کہ انسان جتنی بھی عمر کا ہو جائے بزرگوں کے سامنے بچہ ہی رہتا ہے۔ وہ جب چاہیں اس کی گوشمالی کر سکتے ہیں۔

"پندرہ روز ہیں تمہارے پاس مجھے بھی مومنہ کے لیے بہت کچھ لینا ہے۔ مہمانوں کی لسٹ بنانی ہے۔" وہ بیک وقت سمیر اور اس سے مخاطب تھے۔

☆☆☆

"ثناء موی کہاں ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

ثناء نے بیڈ پہ لیٹے سرتاپا چادر میں ملفوف وجود کی طرف اشارہ کیا۔ بس گلابی دوپٹے کے کونے کی جھلک نظر آ رہی تھی جو چادر سے باہر رہ گیا تھا۔ ثناء نے شیر افگن کو کرسی پیش کی۔

"سمیر بھائی آپ اپنے دوست سے کہیں کہ فوراً انکل کے پاس چلا جائے اسے اپنے جراثیم کہیں انہیں بھی نہ لگا جائے۔ یہ نہ ہو کہ وہ مجھے ہی مارنے لگیں۔" چادر کے اندر سے ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی وہ سمجھ رہی تھی کہ سمیر اکیلا ہی آیا ہے۔ دبی دبی مسکراہٹیں ابھریں موی چادر پھینک کر بیڈ سے چھلانگ لگا کر اتری اور پھر وہیں جم گئی جیسے فرشتے کوچ کر گئے ہوں۔ شیر افگن عین سامنے بیٹھا لبوں میں مسکراہٹ دبائے بڑی جاندار نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔

"موی شیر برائیڈل ڈریس کا کلر پوچھنے آیا ہے۔" سمیر مزے سے بولا تو وہ تپ گئی۔

"کفن لے آئیں سفید رنگ کا۔" سب کے سامنے یہ سوال پوچھے جانے پر اسے شدید غصہ آیا۔ ثناء نے نامحسوس انداز میں سمیر کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ موی بے خبری میں ماری گئی۔ سمیر اور ثناء بیک وقت نکلے اس سے پہلے کہ وہ چھلانگ لگا کر دروازے تک پہنچتی شیر افگن نے اسے پکڑ لیا اور دائیں ہاتھ سے دروازہ بھی بند کر دیا۔

"اب کیا تکلیف ہے۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"جناب! انکل نے ہماری درخواست کی منظوری دے دی ہے۔ دیکھنا تو اب ہم نے آپ کو ہے وہ بھی ساری زندگی۔"

"مجھے معلوم ہے سب، رہنے دیں اس اداکاری کو اس کے بغیر بھی آپ کی بات بن جائے گی۔ یہ لوگ پھر مجھے اسی جہنم میں بھیج رہے ہیں آپ کو تو خوش ہونا چاہئے۔ آپ دوبارہ سے اپنی حسرت نکال سکیں گے نہ کوئی آپ کا ہاتھ روکنے والا ہوگا نہ زبان پکڑنے والا۔" موی کی پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے لرز رہی تھیں۔

''بے وقوف پاگل احمق لڑکی۔'' شیر افگن نے دائیں بازو کے گھیرے میں اسے سمیٹ لیا اور بڑی نرمی سے انگلیوں سے اس کے آنسو صاف کئے۔ ''یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ تمہیں میرے رویے نے بہت ہرٹ کیا ہے کیونکہ جو ہوا اس کا پس منظر بہت پرانا ہے جو میرے ڈیڈی کی شہادت سے شروع ہوتا ہے۔ میں میٹرک کا طالب علم تھا جب ان کی خون آلود لاش گھر آئی تھی اخبارات میں بطور قاتل جلیل کا نام اچھالا گیا۔ میں تعلیم مکمل کر کے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں آ گیا میری زندگی کا ایک ہی مشن تھا جلیل کی تلاش اور اسے کیفر کردار تک پہنچانا ریکارڈ میں اس کی بیٹی کی جو تصویر اور نشانیاں تھیں تم ہو بہو ان پر پوری اترتی تھیں۔ میں تمہارے ذریعے سے اس تک پہنچنا چاہتا تھا اور پہنچ بھی گیا جو کہ میرے بھول تھی۔ قاتل تو کوئی اور تھا اگر وہ انتقام کا آتش فشاں میرے اندر دہک نہ رہا ہوتا تو تمہیں ان المناک واقعات سے شاید نہ گزرنا پڑتا۔ میں تم سے تمہارے والد کی موت کی تعزیت کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔'' وہ اسے ہنوز اپنی گرفت میں لیے ہوئے بولا۔

''مجھے پپا کی موت کا اب کوئی غم نہیں رہا ہے پہلے بہت زیادہ تھا اب نہیں ہے۔ شاید اس طرح کی موت سے ہمکنار ہو کر انہوں نے اپنے جرائم و گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ میری ذات کی حد تک ذلت کے تمام داغ دھو دیے ہیں۔ میری امی کا کیا قصور تھا میرا کیا قصور تھا مجھے کن گناہوں کی سزا ملی ہم تو پل پل مرتے رہے۔ میرے پپا موت سے پہلے کئی بار مرے ہوں گے اور یہ موت کتنی بھیانک ہوتی ہے اندازہ ہے آپ کو وہ کتنے عرصے بعد آئے تھے ہماری خوشیوں میں شریک ہونے کے لئے۔ آپ کے ڈیڈی کو توپوں کی سلامی دے کر قومی پرچم میں لپیٹ کر دفن کیا گیا واہ واہ ہوئی آہ میرا باپ کتنی حسرت میں مرا جو لمحہ لمحہ کفارہ ادا کرتا رہا ہو اسے اتنا نہ گرائیں اسے اتنی حقارت سے نہ دیکھیں محبت نہیں کر سکتے تو نفرت بھی مت کریں۔'' موی بری طرح بکھر رہی تھی۔

شیر افگن کے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آج وہ لاجواب ہو گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے، کیسے بہلائے ابھی اس کے رونے کی آواز سن کر کوئی اس طرف آ گیا تو یقیناً اسے ہی ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

''موی بس کرو دیکھو تو میری شرٹ بھیگ گئی ہے۔ تمہارے گھر والے واقعی مجھے نہیں بخشیں گے۔ اب چپ کر جاؤ۔ میں تو تمہارے لیے خوشیوں کی نوید اور صلح کا پیغام لے کر آیا تھا۔ تم نے سمندر بہانے شروع کر دیے ہیں۔ میں تم سے ایک بات شیئر کرنے آیا تھا۔''

''کیا؟'' موی فوراً رونا بھول گئی۔

''میں تمہارے پپا کی قبر پر گیا تھا فاتحہ پڑھنے موی وہ اتنی نفرت کے قابل نہیں تھے۔ وہ تو ایک کٹھ پتلی تھے جو دوسروں کے اشارے پر ناچتے تھے۔ کٹھ پتلی بذات خود بے جان ہوتی ہے اس کے پیچھے جو ہاتھ ہوتے ہیں وہ جاندار ہوتے ہیں تمہارے پپا اور زبیر کا کٹھ پتلی اور ہاتھ والا رشتہ تھا۔''

''آپ اتنی دیر سے تمہارے پپا کہے جا رہے ہیں آپ کے کچھ نہیں لگتے۔'' وہ آنسو صاف کر رہی تھی۔

''بھول ہو گئی وہ میرے سسر ہیں بلکہ ہوتے تھے۔'' شیر افگن نے اس کا لٹکتا دوپٹہ اس کے شانے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''دوپٹہ مجھے تمہیں اوڑھنا سکھانا پڑے گا جب بھی دیکھا زمین پہ سجدے کرتے پایا ہے اسے اور ہاں وکیل کو وہ دھمکی والی بات کیوں بتائی تھی۔ میں نے تو دوسرے معنوں میں کہا تھا کہ تمہارا ایکا کام کرنے پڑے گا۔''

''کن معنوں میں سمجھا دیں ناں میں بڑی نالائق ہوں۔'' موی گھبرائی۔

''چند روز اور میری جان فقط چند روز اور...... ابھی موقعہ نہیں ہے۔'' شیر افگن نے دوبارہ اسے قریب کرنے کی کوشش کی وہ چکنی مچھلی کی طرح گرفت سے پھسل گئی۔

''سمیر بھائی انہیں لے جائیں ورنہ میں انکل سے کہتی ہوں۔'' وہ زور سے بولی تو جھٹ دروازہ کھول کر سمیر اندر آ گیا۔

''چلئے۔'' اس نے شیر افگن کا بازو پکڑا تو اس نے کونے میں کھڑی موی کو نگاہوں کی زبان میں دھمکی دی۔ وہ پھر زور سے ہنسنے لگی۔ شیر افگن کو آج اس کے ہنسنے پر غصہ نہیں آیا وہ خود بھی تو اس کے لبوں پہ مسکراہٹیں دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

ختم شد

☆☆☆☆☆☆